اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور

مولانا سید جلال الدین عمری

اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی

اسلام میں
خدمتِ خلق کا تصور

مولانا سید جلال الدین عمری

اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی

کتاب : اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور

مصنف : مولانا سید جلال الدین عمری

ناشر : اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی

تقسیم کنندہ : مکتبہ معارفِ اسلامی، کراچی
ڈی۔۳۵، بلاک۔۵، فیڈرل بی ایریا
کراچی۔۷۵۹۵۰
فون: ۶۳۴۹۸۴۰۔۶۸۰۹۲۰۱

اشاعت: ذوالقعدہ ۱۴۲۶ھ۔ دسمبر ۲۰۰۵ء

قیمت : ۱۱۰/=

مباحث

فہرست مضامین

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اسلام نے جن موضوعات کو خاص اہمیت دی اور جن پر تفصیل سے بحث کی ہے ان میں خدمتِ خلق کا موضوع بھی ہے۔ اس نے خدمت کی اہمیت واضح کی، اس کی ترغیب دی، خدمت کا مجمل سا تصور ہی نہیں دیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ وہ کون لوگ ہیں جن کی خدمت ہونی چاہیے اور جو ہمارے حسنِ سلوک کے مستحق ہیں؟ اس نے کہا کہ سارے مسلمان ایک امت ہیں، انہیں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہیے، لیکن یہ حقیقت انہیں فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ وہ پوری نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے ذمہ دار ہیں اور اس ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ کسی فردِ بشر سے تعصب نہ برتا جائے اور وقتِ ضرورت اس کی ممکنہ خدمت کی جائے، اس نے چھوٹی بڑی ہر طرح کی خدمات کی ترغیب دی تاکہ ہر شخص آسانی سے ان میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔ اس کے ساتھ رفاہی خدمات کی اہمیت اجاگر کی اور اس میں فرد اور ریاست دونوں کو شریک کیا۔ خدمت کا جذبہ غلط رُخ اختیار کرتا ہے تو بڑی بے اعتدالیاں ظہور میں آتی ہیں، ان کا ازالہ کیا، خدمت کے بارے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں انہیں دور کیا اور دین کے نظامِ فکر و عمل میں اس کا صحیح مقام متعین کیا۔ بے لوث خدمت کا جذبہ ابھارا اور اخلاص کی روح پیدا کی۔

کتاب میں ان تمام پہلوؤں پر قرآن و حدیث کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ کوشش اس بات کی رہی ہے کہ موضوع سے متعلق آیات و احادیث کا بڑی حد تک احاطہ ہو جائے اور سیاق و محل کی مناسبت سے ان کا صحیح مفہوم واضح ہو جائے۔

اس ضمن میں خدمتِ خلق کے وہ پہلو بھی سامنے آجائیں جن کا موجودہ دور تقاضا کرتا ہے۔ اس پوری بحث میں جہاں ضرورت محسوس ہوئی فقہ، سیرت اور لغت سے بھی مدد لی گئی ہے۔

اس موضوع پر راقم کا ایک کتابچہ 'انسانوں کی خدمت' کے عنوان سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا پاکستان سے بھی اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس قدر اہم موضوع پر کوئی مستقل تصنیف ہماری زبان میں نہیں تھی۔ امید ہے اس کتاب سے یہ کمی کسی حد تک پوری ہو سکے گی۔ ایک کتاب کمزور طبقات سے متعلق زیر ترتیب ہے۔ اس کی اشاعت سے انشاء اللہ موضوع کے کچھ اور گوشے نکھر کر سامنے آئیں گے۔ ویسے اس دوسری کتاب کے بعض مباحث سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ اور ماہنامہ زندگی نو دہلی میں شائع ہو چکے تھے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے اور اس کے بندوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔

جلال الدین (۲۰ فروری ۱۹۹۱ء)

طبع دوم

اللہ تعالیٰ کا بے پایاں کرم و احسان ہے کہ اس نے اس کتاب کو مقبولیت عطا کی۔ اس کا انگریزی ترجمہ ڈی، رحمت اللہ صاحب انگلش لکچرر اسلامیہ کالج۔ وانمباڑی (ٹمل ناڈو) نے بڑے ذوق و شوق اور اخلاص کے ساتھ THE CONCEPT OF SOCIAL SERVICE IN ISLAM کے نام سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ جامعہ دارالسلام عمر آباد (مدراس) کے شعبۂ تحقیق سے شائع ہوا ہے اور اس کی فروخت کا انتظام اسلامک فاونڈیشن ٹرسٹ مدراس نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ سے بھی یہ کتاب مل سکتی ہے۔ ٹمل ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ جامعہ عمر آباد کے پیش نظر اس کی اشاعت بھی ہے۔ ہندی ترجمہ پر نظر ثانی ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ اسلامی ساہتیہ پرکاشن اس کی اشاعت کا نظم کرے گا۔

اس وقت اصل کتاب کا دوسرا ایڈیشن آپ کے سامنے ہے۔ اس میں کتابت و طباعت کی غلطیوں کی ممکنہ حد تک اصلاح کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں سے درگزر فرمائے اور اس کی افادیت کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرے۔

جلال الدین

۹ جنوری ۱۹۹۶ء

موضوع کا تعارف

خدمت ایک فطری جذبہ ہے

اللہ تعالیٰ کی بے شمار مخلوقات میں انسان اس کی سب سے اشرف اور اعلیٰ مخلوق ہے۔ یہاں اسی کی خدمت کا ذکر ہے۔ جب کسی کے گھر بچہ پیدا ہوتا ہے تو پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے، مسرت کے شادیانے بجنے لگتے ہیں، دور و نزدیک کے احباب کی طرف سے مبارک باد دی جاتی ہے، والدین اور قریبی اعزا اپنی حیثیت کے مطابق اس کی خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ بے زبان اور مجبور و بے بس بچہ کی بھوک پیاس کا خیال رکھا جاتا ہے، اس کے درد اور تکلیف کو سمجھنے اور اسے دور کرنے کی تدبیر کی جاتی ہے، علاج کی ضرورت ہوتی ہے تو اپنی استطاعت کے مطابق بروقت علاج ہوتا ہے۔ اسے پاک صاف رکھنے اور اس کی گندگی کو دور کرنے میں کوئی تکدر اور انقباض نہیں محسوس ہوتا۔ ذرا بڑا ہونے پر اس کی شوخی اور شرارت اور شور اور ہنگامے کو خوشی خوشی برداشت کیا جاتا ہے، کچھ اور بڑا ہونے پر اس کی تعلیم و تربیت اور ترقی کی فکر ہوتی ہے۔ غرض کوشش اس بات کی رہتی ہے کہ عمر کے ساتھ اس کی ضروریات پوری ہوتی رہیں، اس کی صحیح نشو و نما ہو، خوب پھلے پھولے اور آئندہ چل کر کامیاب زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے۔ اس میں کسی پہلو سے کمی ہو تو اس کے چاہنے اور محبت کرنے والوں کو افسوس اور صدمہ ہوتا ہے۔ بچہ اگر کسی رئیس، حاکم، سرمایہ دار یا زمیندار کا [illegible] کی ضروریات اور [illegible] زیادہ اہتمام [illegible]

ساتھ پورے کیے جاتے ہیں، اس کی ذرا ذرا سی تکلیف پر ماں باپ اور خویش و اقارب کے علاوہ خادموں اور ماماؤں کی ٹیم کی ٹیم حرکت میں آجاتی ہے اور اسے سکون و راحت پہنچانے کی ممکنہ کوشش ہونے لگتی ہے۔

اس خدمت، ایثار اور قربانی کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ بچہ ہمارا ہے، ہمارا عزیز اور ہمارے خاندان کا فرد ہے۔ اس کی نشوونما، تعلیم و تربیت اور ترقی میں مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ یہ ایک بالکل فطری جذبہ ہے جو انسان کے اندرون سے ابھرتا ہے۔ قدرت اس کے ذریعہ نسلِ انسانی کے بقا کا انتظام کرتی ہے۔ اسی لیے دنیا نے انسان کے اس پاکیزہ جذبہ کی ہمیشہ ستائش کی ہے۔ اس کا کمزور ہونا نسلِ انسانی کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ خدانخواستہ یہ مفقود یا معدوم ہو جائے تو دنیا کی بہار لٹ جائے گی اور ہر طرف خزاں چھا جائے گی۔

بچہ کی معصوم فطرت

بچہ سے اس جذباتی تعلق میں اس بات کا بھی بڑا دخل ہے کہ بچہ معصوم سرشت ہوتا ہے۔ اس کا سینہ ان تمام مذموم جذبات سے پاک ہوتا ہے جو انسانوں کے درمیان دوری پیدا کرتے اور عناد، دشمنی اور فساد کا سبب بنتے ہیں۔ اس کا کسی چیز پر دعویٰ نہیں ہوتا، اسے کسی سے شکایت اور مخاصمت نہیں ہوتی، وہ چھل کپٹ نہیں رکھتا، وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا کہ کسی کو دے سکے، البتہ وہ پیار اور محبت دے سکتا ہے، دیتا ہے، مسکراہٹ بکھیر سکتا ہے، بکھیرتا ہے۔ پھر اس سے کوئی کیوں نہ محبت کرے اور اس سے پرخاش رکھے؟

فطرت سے انحراف شروع ہوتا ہے

وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ بچہ بھی شب و روز اور ماہ و سال طے کرتے ہوئے بڑا ہوتا اور نشوونما پاتا ہے، شعور کو پہنچتا ہے، شعور میں پختگی آتی

ہے، اس کے اندر اپنی شخصیت اور انفرادیت کا احساس ابھرتا ہے۔ حرّیتِ فکر اور آزادی کا دور شروع ہوتا ہے، وہ کسی کے خیالات کا پابند نہیں ہوتا، اس معاملہ میں اختلاف عزیزوں اور قرابت داروں تک سے شروع ہو جاتا ہے، اس کے اپنے جذبات ہوتے ہیں جن میں وہ رکاوٹ پسند نہیں کرتا، وہ دوسروں کی خواہشات کا پابند نہیں ہوتا، اس کی ذاتی خواہشات ہوتی ہیں جو اسے اپنے ساتھ لے چلتی ہیں، اس کے اندر اپنے حقوق کا احساس شدت سے جاگ اٹھتا ہے، ان سے وہ دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا، وہ اپنے مفادات کی ہر قیمت پر حفاظت کرنا چاہتا ہے۔ کچھ آگے بڑھتا ہے اور آہستہ آہستہ حرص و ہوس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس آگ کو بجھانے کے لیے اسے غلط طریقے اور ناجائز تدابیر بھی اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ خلوص کی دولت اس سے چھن جاتی ہے، اس کے اقدامات بے غرض اور بے لوث نہیں ہوتے، وہ اپنے مفادات کے پیش نظر لوگوں سے ربط قائم کرتا اور معاملہ کرتا ہے۔ اس کی دوستی اور دشمنی اسی کے تابع ہو کر رہ جاتی ہے۔ دوسرے بھی اسے مفادات کے بندے ہی کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اپنا حریف اور مخالف تصور کرنے لگتے ہیں۔

اس طرح محبت، ہمدردی، خدمت اور ایثار و قربانی کا ماحول رفتہ رفتہ بدلتا چلا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو جذبات کی پوری دنیا زیر و زبر ہو کر رہ جاتی ہے۔ قریبی عزیزوں، سگے بھائیوں، یہاں تک کہ ماں باپ اور اولاد میں نزاعات کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوستی کی جگہ دشمنی، ایثار کی جگہ انتقام اور خدمت کی جگہ اذیت لے لیتی ہے۔ جو بچہ محبت کے پھول بکھیر رہا تھا وہ نفرت کے شعلے برسانے لگتا ہے اور جو افراد اسے سینہ سے لگائے ہوئے تھے انھیں اس کی قربت ناگوار گزرتی ہے۔

اسلام کا اصلاحی کردار

دنیا کے مختلف مذاہب نے کوشش کی ہے کہ انسان کو زندگی بھر وہی محبت

ملے جو اس دنیا میں آتے وقت اسے ملتی ہے اور مفادات کا ٹکراؤ اس محبت کو ختم نہ کرے۔ وہ کم زور اور ناتواں ہو تو اس کی خدمت کی جائے اور جب وہ توانا اور طاقت ور ہو تو دوسروں کی خدمت کرے، وہ بے بس اور بے اختیار ہو تو اسے سہارا دیا جائے اور اس کے ہاتھ میں اختیار و اقتدار آئے تو وہ دوسروں کا سہارا بن جائے۔ اس معاملہ میں اسلام نے بے مثال کردار ادا کیا ہے۔ اسی کی تھوڑی سی وضاحت یہاں کی جا رہی ہے۔

خدا سے تعلق خدمت کے جذبہ کو مستحکم کرتا ہے

اس میں شک نہیں کہ انسان کے اندر خدمت کا جذبہ موجود ہے لیکن ذاتی اغراض، شخصی اور گروہی مفادات اور نفسانی خواہشات اس جذبہ پر غالب آجاتے ہیں اور انسان کو اپنے ہی جیسے انسانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کا رویہ اختیار کرنے میں کبھی تامل نہیں ہوتا۔ بسا اوقات تو وہ درندگی اور بہیمیت پر اتر آتا ہے۔ اسلام کے نزدیک خلوصِ دل سے خدائے تعالیٰ کی عبادت اور اس سے تعلق کے ذریعہ انسان ان کم زوریوں پر قابو پا سکتا ہے۔ اس لیے کہ انسانوں کی خدمت کا رشتہ خدا کی عبادت سے جڑا ہوا ہے۔ جس دل میں خدا کی محبت موجزن ہوگی وہ اس کے بندوں کی محبت سے خالی نہیں ہوگا۔ خدا سے انسان کا تعلق جس قدر استوار ہوگا، بندوں سے بھی اس کا تعلق اسی قدر مضبوط ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید جب انسانوں کے حقوق، ان کی خدمت، اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر کرتا ہے تو اس کے آگے پیچھے اللہ تعالیٰ کی عبادت، تقویٰ یا نماز کا ذکر کرتا ہے[1] یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس سے تعلق انسان کے اندر بندوں کے حقوق پہچاننے

---

[1] اس کی متعدد مثالیں کتاب میں موجود ہیں۔

اوران کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس تعلق کے کم زور اور مضمحل ہونے کے بعد ان حقوق کے ادا کرنے میں غفلت اور کوتاہی لازماً پیدا ہو گی۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو اور اس کے شب و روز کے احسانات کو بھول بیٹھے وہ بڑی آسانی سے بندوں کے احسانات کو فراموش کر سکتا ہے۔ ان کے حقوق کا اس کے ہاتھوں ضائع ہونا ہرگز تعجب خیز نہ ہو گا۔

خدا کے نیک بندے خلوص سے خدمت کرتے ہیں

قرآن مجید نے پوری انسانی تاریخ کا تجربہ ہمارے سامنے رکھا ہے کہ جن لوگوں میں خدا کا خوف ہوتا ہے اور جو صحیح معنوں میں اس کے عبادت گزار ہوتے ہیں، انسانوں کے ساتھ ان کا رویہ بھی ہمدردی اور خیر خواہی کا ہوتا ہے۔ وہ کسی کا حق نہیں مارتے، کسی پر دستِ تعدی دراز نہیں کرتے اور ظلم و ناانصافی سے ان کا دامن پاک ہوتا ہے۔ وہ کسی ذاتی غرض یا خارجی دباؤ کے بغیر انسانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی دنیوی مفاد نہیں ہوتا، وہ اسے شہرت اور ناموری کا ذریعہ نہیں بناتے اور اس بہانے سے لوگوں کو قریب کرنا اور ان پر اپنی حکم رانی اور سیادت قائم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اسے ایک فرض سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ وہ صرف اللہ کی رضا کے طالب ہوتے ہیں اور اسی سے صلہ کی تمنا کرتے ہیں۔ ان کے دشمن بھی ان کی شرافت، تہذیب، اخلاق، ہمدردی اور خیر خواہی کی گواہی دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب بھی انسان خدا کے خوف سے بے نیاز ہوا، انسانوں کے ساتھ اس کا رویہ غلط ہو گیا۔ وہ عدل و انصاف سے پھر گیا، ظلم و زیادتی کی راہ اختیار کی اور دوسروں کے حقوق تلف کیے، غرض یہ کہ ہر وہ زیادتی کی جس کا تصور کیا جا سکتا ہے[1]

---

[1] بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ خدمتِ خلق کے لیے خدا اور مذہب پر ایمان ضروری نہیں ہے۔

خدمت کے لیے جذبات کی پاکیزگی ضروری ہے

خدمت کے لیے انسان کے سینہ کو پاکیزہ جذبات کا مرکز ہونا چاہیے۔ وہ صحیح معنی میں اسی وقت خدمت کر سکتا ہے جب کہ اس کے اندر ہمدردی، رحم و کرم، ایثار و قربانی، عفو و درگزر، صبر و تحمل اور اخلاص اور بے غرضی جیسی اخلاقی خوبیاں پائی جائیں اور حرص، لالچ، بغض و حسد، ظلم و جبر اور مکر و فریب جیسی کمزوریوں پر وہ قابو پا لے، ورنہ خدمت کا حق ادا نہ ہوگا اور کبھی کوئی خدمت ہوگی بھی تو آلائشوں سے پاک نہ ہوگی۔ اسلام انسان کو اعلیٰ اخلاقیات سے آراستہ کرتا اور رذائلِ اخلاق سے بچاتا ہے۔ اس اخلاقی تربیت کے لیے اس کے نزدیک تبلیغ و تلقین اور ترغیب و ترہیب کا ایک پورا نظام ہے۔ وقتِ ضرورت وہ قانون سے بھی مدد لیتا ہے۔

اقتدار خدمت کے لیے ہے

اس دنیا میں انسان کو طاقت، قوت، دولت، ثروت، حکومت اور اقتدار

اس کے بغیر بھی خدمت ہوتی رہتی ہے۔ اس کے ثبوت میں مغربی قوموں کا ذکر کیا جاتا ہے کہ انھوں نے پوری دنیا میں زبردست رفاہی کام کیے ہیں۔ اس کا جواب ہماری اس وضاحت میں پوشیدہ ہے کہ انسان کی فطرت میں اپنے ابناءِ نوع کی خدمت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ یہ اسی کا اظہار ہے، لیکن جب اس جذبہ سے ذاتی اور قومی مفادات ٹکراتے ہیں تو وہ مضمحل ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کے بالکل منافی روش انسان اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ یہی اقوامِ مغرب جن کی رفاہی خدمات کا ہر طرف چرچا ہے اپنے مفادات کی خاطر مخالف قوموں کی معاشی ناکہ بندی کرتی ہیں ان پر سیاسی دباؤ قائم رکھتی ہیں اور جبر و استحصال کے تمام حربے استعمال کرتی ہیں۔ اس طرح انھیں تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں۔ خدا پرستی اسی سے افراد اور اقوام کو محفوظ رکھتی ہے اور خدمت کے فطری جذبہ پر مفادات کو غالب آنے نہیں دیتی

اس لیے نہیں ملتا کہ وہ دوسروں کو غلام بنائے اور اپنی حکم رانی کا ڈنکا پیٹے، بلکہ جس دائرہ میں اسے وسائل و ذرائع حاصل ہوں اس میں اس کا امتحان ہے کہ یہ وسائل اللہ کے بندوں کے کام آتے ہیں یا نہیں؟ وہ ان کے حقوق پہچانتا ہے یا نہیں؟ یہ وسائل و ذرائع جتنے زیادہ ہوں امتحان بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔ ذیل کی آیت اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِى الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَا اٰتَاكُمْ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ الرَّحِيْمٌ ٥ (الانعام: ۱۶۵)

وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھیں زمین میں خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کے مقابلہ میں بعض کے درجے بلند کیے تاکہ اس نے جو کچھ تمھیں دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے۔ بے شک تمھارا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور وہ غفور و رحیم بھی ہے۔

خدمت جبر سے پاک ہو

اس دنیا میں خدمت لی بھی جاتی ہے اور کی بھی جاتی ہے۔ جہاں خدمت لی جاتی ہے وہاں بسا اوقات جبر کا عنصر شامل ہو جاتا ہے، ظلم و زیادتی ہوتی ہے، استحصال ہوتا ہے، حقوق مارے جاتے ہیں، جذبات مجروح ہوتے ہیں اور انسان کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ یہ سلسلہ جب دراز ہوتا ہے تو غلامی کے حدود کو چھونے لگتا ہے۔ اسلام ہر طرح کے جبر و ظلم کے خلاف ہے اور اسے مٹا دینا چاہتا ہے۔

خدمت باعثِ توقیر ہے

یہی خدمت اگر خلوص اور محبت سے ہو، اس کے ساتھ ذلیل اغراض وابستہ نہ ہوں تو خدمت کرنے والے کے لیے وہ عزت و توقیر کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے

حق میں محبت اور احترام کا جذبہ ابھرتا ہے، اس کی عظمت محسوس کی جاتی ہے اور وہ دلوں پر حکومت کرنے لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے اور بالکل صحیح کہا جاتا ہے ہر کہ خدمت کرد مخدوم گشت۔

جہاں تک آخرت کا تعلق ہے جو خدمت اخلاص کے ساتھ انجام پائے اس کے اجر و ثواب کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ وہ بے پایاں اور بے حساب ہوگا۔ اس محدود دنیا میں ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اسلام اور بندگانِ خدا کی خدمت

انسانوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک اخلاق کا موضوع ہے۔ اخلاقیات سے تعلق رکھنے والے تمام مکاتب فکر نے اسے اپنی تعلیمات میں جگہ دی ہے۔ اسی طرح دنیا کے سب ہی مذاہب نے اس کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ اس کی تصدیق اور تائیدان کے نوشتوں اور صحیفوں سے ہوتی ہے۔

خدمتِ خلق پیغمبروںؑ کی تعلیم میں

قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے بہت سے پیغمبروں اور ان کی تعلیمات کے بکثرت حوالے دیئے گئے ہیں۔ ان میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسل کے اسرائیلی پیغمبروں کا ذکر کسی قدر تفصیل سے آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے ان پیغمبروں نے بنو اسرائیل سے انسانوں کے حقوق پہچاننے، ان کی خدمت اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا بھی عہد لیا تھا۔ اس عہد کو اس نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ

یاد کرو جب ہم نے بنو اسرائیل سے یہ پختہ عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو گے اور (اسی طرح) قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے

إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ ۝ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ ۝ (البقرہ: ۸۳، ۸۴)

ساتھ بھی) حسن سلوک کروگے اور عام لوگوں کے ساتھ اچھی طرح بات کروگے، نماز قائم کروگے اور زکوٰۃ دوگے لیکن سوائے چند ایک کے تم سب اس سے پھر گئے اور یہ بھی یاد کرو کہ ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور اپنے لوگوں کو گھروں سے نکال کر بے گھر نہ کروگے۔ پھر تم نے اس کا اقرار بھی کیا تھا اور تم اس کی شہادت بھی دیتے ہو۔

یہ آیات صراحت کرتی ہیں کہ بنواسرائیل سے ایک تو اللہِ واحد کی عبادت اور انسانوں کے ساتھ حسن سلوک کا عہد لیا گیا تھا۔ دوسرا عہد یہ تھا کہ ان کا دامن ہمیشہ ظلم و زیادتی سے پاک رہے گا۔ حسنِ سلوک کا ظلم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے۔ انسانوں کی خدمت کا جذبہ، بے رحمی اور شقاوت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا۔ جو شخص دوسروں کا خون بہاتا پھرے وہ ان کے زخموں کے لیے مرہم نہیں فراہم کرے گا۔ اسی طرح خدمت کرنے والا ہاتھ جور وستم کے لیے نہیں اٹھے گا۔ یہ مختلف کردار ہیں اور مختلف جذبات کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ خدمت سے قوموں کی زندگی وابستہ ہے اور ظلم نے بڑی بڑی جابر اور سرکش قوموں کی کمر اس طرح توڑ کر رکھ دی کہ ان میں سے بہت سی قوموں کو پھر اٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ بنواسرائیل نے اس حیات آفریں عہد و پیمان کی قدر نہیں کی۔ اسے توڑتے اور پامال کرتے رہے۔ انھوں نے خدا کی کتاب کے بعض احکام پر عمل کیا اور بعض کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اپنی ہی قوم کے لوگوں کو قتل کیا، انھیں گھروں سے نکالا اور اس مقصد کے لیے دشمنوں تک سے ساز باز اور ان کی مدد کی۔ اس سے ان کی قوت اور وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ انھیں دنیا میں بھی ذلت اور رسوائی اٹھانی پڑی اور آخرت کے عذاب میں بھی وہ بری طرح پکڑے جائیں گے۔ (البقرہ: ۸۵)

قرآن اور خدمتِ خلق

قرآن مجید نے خدا کے ان برگزیدہ بندوں کی تعلیمات کو جذب کر کے اپنے اوراق پر پھیلا دیا ہے۔ اس نے اپنے آغاز نزول ہی سے بنیادی عقائد کے بعد، دو باتوں پر خاص طور سے زور دیا۔ ایک یہ کہ انسان کا خدا سے تعلق مضبوط ہو۔ وہ صرف اسی کی عبادت کرے اور اس کے سوا کسی کے سامنے اپنا سر نہ جھکائے۔ دوسرے یہ کہ انسانوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آئے اور حق داروں کا حق پہچانے، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرے، قرابت داروں، ہمسایوں، یتیموں، مسکینوں اور حاجت مندوں کی جو ضرورتیں پوری کر سکتا ہے پوری کرے۔ کوئی بھی شخص جو اس کی خدمت کا مستحق ہو اور جس کی خدمت کرنا اس کے امکان میں ہو، وہ اس کی خدمت سے محروم نہ رہے۔ وہ طاقت ور ہے تو کمزوروں پر دست درازی نہ کرے بلکہ ان کو سہارا دے اور ان کی تقویت کا ذریعہ بنے۔ لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی اپنے جان و مال اور عزت و آبرو کی طرح حفاظت کرے، کسی کے ساتھ دھوکے اور فریب کا معاملہ نہ کرے، بلکہ ہر حال میں عدل و انصاف اور دیانت و امانت پر قائم رہے۔ اس کا وجود معاشرہ کے لیے کلفت و آزار کا باعث نہ ہو۔ بلکہ آسائش و راحت کا سبب بنے اور اس کی ذات سے سب کو نفع پہنچے، کسی کو ضرر نہ اٹھانا پڑے۔ قرآن مجید نے ان باتوں کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ بار بار کہیں اختصار کے ساتھ اور کہیں تفصیل سے ان کا ذکر کیا ہے۔ اس کا ایک بڑا اچھا اور عمدہ نمونہ ہمیں سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں ملتا ہے۔ فرمایا گیا 'اللہ کا فیصلہ ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، وہ بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو خصوصیت سے ان کا خیال رکھو۔ ان کے سامنے تواضع اور خاکساری کے ساتھ جھک جاؤ۔ درشتی اور سختی سے نہ پیش آؤ اور ان کے لیے دعائیں کرتے رہو، قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق

ادا کرو۔ اگر اپنی عسرت اور افلاس کی وجہ سے ان کی مدد نہ کر سکو تو نرمی سے معذرت کر دو۔ اپنی اولاد کو اس خطرے سے نہ مار ڈالو کہ تم ان کو کچھ کھلا نہ سکو گے۔ اللہ تعالےٰ تمھیں بھی کھلائے گا اور انھیں بھی کھلائے گا۔ قتل اور وہ بھی اپنی اولاد کا قتل بہت بڑا گناہ ہے۔ زنا کے قریب نہ پھٹکو، یہ بے حیائی کا کام اور زندگی کا غلط راستہ ہے۔ اللہ نے انسان کی جان کو باعزت اور محترم ٹھہرایا ہے۔ اس لیے جب تک حق وانصاف اس کی جان لینے کا تقاضا نہ کریں اس کے خون سے اپنا ہاتھ آلودہ نہ کرو۔ یتیم کو بے آسرا سمجھ کر اس کا مال نہ کھاؤ۔ جب وہ جوان ہو جائے تو اس کا مال اس کے حوالے کر دو۔ عہد وپیمان کو پورا کرو۔ خدا کے ہاں اس کے بارے میں باز پرس ہو گی، ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ جس بات کا تمھیں علم نہیں ہے اس کے بارے میں زبان نہ کھولو۔ یاد رکھو، کان، آنکھ، دل ودماغ ہر ایک کے بارے میں خدا کے ہاں سوال ہوگا۔ تکبر اور غرور کی چال نہ چلو۔ تم نہ ٹھوکر مار کر زمین کا سینہ چاک کر سکتے ہو اور نہ سر اٹھا کر پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ یہ باتیں تمھارے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں[1]۔

قرآن وحدیث میں خدمت خلق پر ایک نہیں متعدد پہلوؤں سے توجہ دلائی گئی اور اس پر زور دیا گیا ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ یہاں ان میں سے بعض کی وضاحت ہو سکے۔

خدا کی نعمتوں کا اعتراف

اس دنیا میں کچھ انسانوں کو ہر طرح کی سہولتیں اور آسانیاں حاصل ہیں اور کچھ انسان ان سے محروم ہیں۔ قرآن مجید کا پہلی قسم کے انسانوں سے مطالبہ ہے

---

[1] بنی اسرائیل: ۲۳ - ۳۸ ۔ یہی مضمون کسی قدر اختصار کے ساتھ سورۂ انعام (۱۵۱ - ۱۵۲) میں بیان ہوا ہے۔ یہاں جن باتوں کی تاکید کی گئی ہے ان میں سے ایک ایک پر قرآن مجید نے متعدد مقامات پر زور دیا ہے۔ اس کی مثالیں اسی کتاب کے اوراق میں ملیں گی۔

کہ وہ دوسری قسم کے انسانوں کی خدمت کریں۔ ان کو ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں اور ان کی زندگی کو خوش گوار بنانے میں مدد دیں۔ جس شخص کو خدا نے دیکھنے کے لیے آنکھ، سننے کے لیے کان، بولنے کے لیے زبان، دوڑ دھوپ کرنے اور محنت مشقت کے لیے مضبوط دست و بازو، سوچنے سمجھنے کے لیے دل و دماغ اور زندگی گزارنے کے لیے سامانِ عیش عطا کیا ہے، اس کا فرض ہے کہ جو شخص معذور ہے، جس کو وسائلِ حیات میسر نہیں ہیں اور جو زندگی کی تگ و دو میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہے اس کو بے سہارا نہ چھوڑ دے کہ وہ بھیک مانگے یا خودکشی کرنے پر مجبور ہو جائے، بلکہ اس کے زندہ رہنے کا ساز و سامان اور اس کے سکون و راحت کے اسباب فراہم کرے۔

اس لیے کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے خدا کی طرف سے ملتا ہے اس لیے اسی کا شکر گزار اسے ہونا چاہیے۔ اس کے شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کے بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے اور جو خدمت کے مستحق ہیں ان کی خدمت کی جائے۔ خدا کی دی ہوئی ہر نعمت میں اس کے بندوں کا حق ہے۔ اس حق کو ادا کیے بغیر اس کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ خدا کی نعمتوں کو پانے کے بعد اگر کسی کے اندر اس کی مخلوق کی خدمت کا جذبہ نہ ابھرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا دل ان نعمتوں کے احساس ہی سے خالی ہے۔ قرآن مجید نے اس بے حسی پر سخت سرزنش کی ہے اور اس کے برے انجام سے آگاہ کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝	کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور ایک
وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ	زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور اس کو
النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ	(حق و باطل) کی دونوں راہیں نہیں دکھا دیں؟
الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ	لیکن وہ گھاٹی پر نہیں چڑھا؟ تم جانتے ہو
مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝	یہ گھاٹی کیا ہے؟ گردن کا چھڑانا (غلام آزاد
اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ	کرانا) یا فقر و فاقہ کے دن کھانا کھلانا، قرابت
مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا	والے یتیم کو یا بدحال مسکین کو۔ پھر وہ ان

ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝ (البلد: ۸-۲۰)

لوگوں میں شامل ہوا جو ایمان لائے جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور (انسانوں کے ساتھ) رحمت و شفقت کے سلوک کی تاکید کی۔ یہی لوگ ہیں جو (قیامت کے دن خدا کے) دائیں جانب ہوں گے اور جنھوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا وہ بائیں جانب والے ہیں۔ ان پر چاروں طرف سے آگ بند ہو گی۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر بے شمار احسانات کیے ہیں۔ ان آیات میں ان میں سے بعض نمایاں احسانات کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آنکھ، کان اور دل و دماغ کی بے نظیر قوتیں اس لیے عطا کی ہیں کہ اسے ایک دشوار گزار گھاٹی طے کرنی ہے۔ وہ ہے غلاموں کو آزاد کرنا اور یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرنا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایمان والوں میں شامل ہو جائے جو عملاً اس گھاٹی کو طے کر رہے ہیں جن کی زندگیاں اللہ کی راہ میں صبر و استقامت کا ثبوت بھی فراہم کر رہی ہیں اور جو اس کی نصیحت بھی کر رہے ہیں، جن کا رویہ مظلوموں، محکوموں، بھوکوں اور پیاسوں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا ہے اور جو اس ہمدردی کی دوسروں کو تلقین و تبلیغ کرتے ہیں۔ یہ راستہ جنت کا ہے۔ اس کی مخالفت کرنے والے جہنم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ اسی میں پہنچیں گے پھر اس کے دروازے اس طرح بند کر دیئے جائیں گے کہ وہ اس سے کبھی نہ نکل سکیں گے۔

بندگانِ خدا کی خدمت خدا کی خدمت ہے

اسلام نے مخلوق کی خدمت کو خالق کی خدمت سے تعبیر کیا ہے۔ اس نے کہا

خدا کے بندوں کی مدد کرنا حقیقت میں خدا کی مدد کرنا ہے۔ ان کے کام آنا خدا کے کام آنا ہے اگر آپ کے روبرو خدا کا کوئی بندہ ہاتھ پھیلائے اور آپ اس کا ہاتھ خالی لوٹا دیں تو گویا آپ نے خدا کے ہاتھ کو خالی لوٹا دیا۔ کوئی مریض آپ کی مدد کا محتاج ہوا اور آپ نے اس کی مدد سے انکار کیا تو گویا خدا کی مدد سے انکار کیا۔ خدا کو خوش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بندوں کو خوش کیا جائے اور ان کو راحت پہنچائی جائے۔ آسمان والا اپنی رحمتیں اسی وقت نازل کرتا ہے جب کہ زمین والوں پر رحمت و شفقت کا سلوک کیا جائے۔ ایک حدیث میں اسی حقیقت کو بہت ہی مؤثر اور دل نشین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسان سے کہے گا۔ اے ابن آدم! میں بیمار پڑا رہا لیکن تو نے میری عیادت نہیں کی۔ انسان گھبرا کر عرض کرے گا اے میرے رب تو سارے جہاں کا پروردگار، تو کب بیمار تھا اور میں تیری عیادت کیسے کرتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے لیکن اس کے باوجود تو اس کی مزاج پرسی کے لیے نہیں گیا۔ اگر تو اس کے پاس جاتا تو مجھے وہاں پاتا۔ پھر خدائے تعالیٰ فرمائے گا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں دیا، انسان عرض کرے گا اے رب العالمین! تو کب بھوکا تھا اور میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا۔ لیکن تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔ اگر تو نے اس کا سوال پورا کیا ہوتا تو آج اس کا ثواب یہاں پاتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے مجھ کو پانی نہیں پلایا۔ انسان عرض کرے گا اے دونوں جہاں کے پروردگار! تو کب پیاسا تھا اور میں تجھے پانی کیسے پلاتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا لیکن تو نے اس کی پیاس بجھانے سے انکار کر دیا تھا اگر تو نے اس کی پیاس بجھائی ہوتی تو آج اس کا ثواب یہاں پاتا۔[1]

[1] مسلم کتاب البر والصلۃ، باب فضل عیادۃ المریض

خدمت خلق کی عظمت اور اہمیت کے لیے یہ بات بہت کافی ہے کہ وہ خالق کی خدمت ہے اور اس سے پہلوتہی کرنا خالق کی خدمت سے غفلت کے ہم معنی ہے۔

ہر حال میں خدمت کا جذبہ ہو

اسلام یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ انسان اس طرح زندگی گزارے کہ اس کی ذات سے خیر کے چشمے جاری ہوں، اس کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں اور مالی وسائل دوسرے انسانوں کے کام آئیں، اپنی حدِ استطاعت کے اندر وہ ان کی مادی اور اخلاقی مدد کرے، وہ گھر سے فتنہ و فساد پھیلاتا ہوا نہ نکلے بلکہ انسانوں کے خیر خواہ اور فلاح و بہبود چاہنے والے کی حیثیت سے سامنے آئے۔ وہ جہاں بیٹھے امن و سلامتی کا پیغام بکھیرتا رہے، دوسروں کی مشکلات کو دور کرے اور ان کی دینی اور اخلاقی اصلاح کی کوشش میں لگا رہے۔

اسلام فرد کو معاشرہ کی مادّی اور اخلاقی خدمت پر جس طرح ابھارتا اور اس کا جذبہ اس کے اندر پیدا کرتا ہے اس کا اندازہ ایک حدیث سے ہو سکتا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایاکم والجلوس علی	راستوں میں بیٹھنے سے بچو۔ صحابہؓ
الطرقات فقالوا مالنا	نے عرض کیا کہ ہمارے لیے اس کے بغیر کوئی
بدٌّ انما هی مجالسنا نتحدث	چارہ نہیں ہے یعنی بیٹھنا ہی پڑتا ہے۔ یہ
فیها، قال فاذا ابیتم الا	ہماری مجلسیں ہیں۔ ان میں ہم بات
المجالس فاعطوا الطریق	چیت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ اگر تم
حقها قالوا وما حق	بیٹھنا ضروری سمجھتے ہو تو راستہ کا حق
الطریق قال غض البصر	ادا کرو۔ صحابہؓ نے سوال کیا کہ راستہ کا
وکف الاذی ورد السلام	حق کیا ہے؟ ارشاد ہوا نگاہیں نیچی رکھنا
والامر بالمعروف ونهی	ایذا رسانی سے بچے رہنا، سلام کا جواب

عن المنکر[1] دینا، معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا۔

یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ بعض اور صحابہؓ سے بھی مروی ہے۔
حضرت ابو طلحہؓ کی روایت میں "سلام کا جواب دینا" کے بعد "حسن کلام" کا ذکر ہے[2]۔
حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں حدیث کے آخر میں "ارشاد السبیل" کا اضافہ ہے[3]
اس کے معنی راستہ دکھانے کے ہیں۔ ایک اور روایت میں "تغیثوا الملھوف وتھدوا الضالّ" کے الفاظ ملتے ہیں[4]۔ یعنی راستہ میں جہاں تم بیٹھے ہو کسی کو فریاد کرتے دیکھو تو فریاد رسی کرو اور بھٹکنے والے کو راستہ دکھاؤ۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ معاشرہ کی طرف سے ایک مومن پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اسے ان کا راستہ اور بازار میں، مجلسوں اور محفلوں میں ہر جگہ خیال رکھنا چاہیئے۔ وہ دوسروں کی عفت وعصمت کا پاسباں ہے، اسے کسی پر بری نگاہ ڈالنے کی اجازت نہیں ہے، وہ دوسروں کی تکلیف دور کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے، اس کی ذات سے کسی کو کسی قسم کی اذیت نہیں پہنچنی چاہیئے۔ جیسے آمد و رفت میں رکاوٹ ڈالنا، گندگی پھیلانا، راہ گیروں سے الجھنا اور بدزبانی کرنا وغیرہ۔ راستہ میں ایذا رسانی کی جو بھی صورتیں ہو سکتی ہیں ان سب سے اس کا دامن پاک ہونا چاہیئے۔ کوئی اس پر امن وسلامتی کی دعا بھیجے تو فوراً اسے اس کا جواب دینا چاہیئے تاکہ وہ اس کی طرف سے اطمینان محسوس کرے۔ پھر یہ کہ وہ جہاں بیٹھے معروف کی تلقین کرے اور منکر سے روکے۔ اس سے معاشرہ میں نیکیوں کو فروغ حاصل ہوگا اور وہ برائیوں سے محفوظ رہے

---

[1] بخاری، کتاب المظالم والقصاص، باب افنیۃ الدور والجلوس فیہا۔ مسلم، کتاب السلام باب من حق الجلوس فی الطریق رد السلام۔

[2] مسلم حوالہ سابق

[3] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الجلوس بالطرقات۔

[4] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الجلوس بالطرقات

گا۔ جب کوئی شخص کوئی غلط قدم اٹھانے کا ارادہ کرے گا اسے محسوس ہوگا کہ سوسائٹی میں اس کا احتساب کرنے کی طاقت موجود ہے۔ راستہ کا یہ بھی حق ہے کہ آدمی بدزبانی اور تلخ کلامی کا مظاہرہ نہ کرے بلکہ اس کے اندازِ تخاطب میں شرافت اور پاکیزگی پائی جائے اور شیریں کلامی کے ساتھ ہر ایک سے پیش آئے۔ اس سے بازار کے بہت سے جھگڑے اور ہنگامے ختم ہو سکتے ہیں۔ مصیبت زدوں کی مدد کرنا اور بھٹکنے والوں کو راستہ دکھانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔[۲۸]

اس طرح اسلام نے ترغیب بھی دی اور تاکید بھی کی کہ معاشرہ کا جو فرد بھی کسی کے دکھ درد میں کام آسکتا ہے ضرور کام آئے، وہ بھوکا پیاسا اور لباس کا محتاج ہے تو اسے کھانا، پانی اور کپڑا فراہم کرے، وہ بے گھر ہے تو اس کی رہائش کا انتظام کرے، وہ بیمار ہے تو اس کا علاج اور تیمارداری کرے، وہ بے روزگار ہے تو اسے روزگار سے لگائے۔ وہ جاہل اور ناخواندہ ہے تو اسے علم و حکمت سے آراستہ کرے اور وہ مظلوم ہے تو دوسروں کی چیرہ دستی سے اس کی حفاظت کرے۔ اس جذبہ کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے اس نے ظلم و زیادتی کی مذمت کی، اس کی قباحت واضح کی اور اس بات پر زور دیا کہ کوئی بھی شخص کسی کی کم زوری، ناتوانی، غربت اور جہالت کا استحصال نہ کرے بلکہ اسے نفع پہنچانے اور اس میں جو نقص اور کمی رہ گئی ہے اسے دور کرنے کی کوشش کرے، اسے کسی تکلیف میں گرفتار دیکھ کر خوشی نہ محسوس کرے بلکہ اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے اور جن مصائب میں وہ گھرا ہوا ہے ان سے نکلنے میں اس کی مدد کرے۔ اس طرح اسلام ایک ایسا معاشرہ فراہم کرتا ہے جس میں ظلم کے خلاف شدید نفرت پائی جائے، اور ہر طرف عدل و احسان کے جذبات کی حکمرانی ہو۔

انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود کی ہر کوشش اسلام کے نزدیک عبادت ہے۔ آئندہ باب میں اس کی تفصیل ملے گی۔

خدمت بھی عبادت ہے

قرآن مجید نے عبادت کو انسان کا مقصدِ حیات قرار دیا ہے (الذاریات:۵۶) عبادت اللہ تعالیٰ سے تقرب اور اس کی رضاجوئی کے لیے کی جاتی ہے۔ یہ بدنی بھی ہوتی ہے اور مالی بھی۔ بدنی عبادت زبان کے الفاظ اور جسم کی حرکات وسکنات کے ذریعہ انجام پاتی ہے اور مالی عبادت میں انسان زر و مال کا نذرانہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرتا ہے۔ مالی عبادت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد خلقِ خدا کی خدمت، نصرت اور اس کا تعاون ہے۔ بدنی عبادت میں اللہ تعالیٰ سے تعلق کو انسان آسانی سے محسوس کرتا ہے لیکن مالی عبادت میں اس تعلق کا اسے ذرا کم ہی احساس ہو پاتا ہے۔ اسے محسوس کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عبادت کے جذبہ سے خدمت انجام دی جائے اور کسی بندۂ خدا کی دست گیری کے وقت خدا سے قربت کا تصور زندہ رہے۔ اس سے مادی و معاشی فلاح کے کام انجام دیتے ہوئے بھی انسان کو عبادت کا کیف و سرور حاصل ہو سکتا ہے۔

اسلام کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کوئی دنیا داری کا عمل نہیں بلکہ عین عبادت ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس کے پورے نظام عبادت کو سامنے رکھنا ہوگا۔

نماز اور زکوٰۃ کا تعلق

نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادت۔ نماز بندے کی طرف سے خدا کی

عظمت و بزرگی اور اپنی عبدیت کا اعلان ہے اور زکوٰۃ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ انسان کے دل میں ہمدردی اور غم خواری کا جذبہ موجود ہے اور وہ دوسروں کے لیے اپنا مال صرف کرسکتا ہے۔ قرآن مجید نے نماز اور زکوٰۃ کا بالعموم ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ دونوں پر یکساں زور دیا ہے اور ان کی بار بار تاکید کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مالی عبادت بھی اس کے نزدیک بدنی عبادت سے کم اہم نہیں ہے۔ خدا کو خوش کرنے کے لیے وہ جس طرح بدنی عبادت کو ضروری سمجھتا ہے اسی طرح مالی عبادت کو بھی لازمی قرار دیتا ہے۔ وہ جس دین کا مطالبہ کرتا ہے وہ صرف یہ نہیں ہے کہ انسان خدا کے دربار میں عقیدت و محبت کے ساتھ جھک جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنی کمائی ہوئی دولت میں خدا کے بندوں کا حق تسلیم کرے اور ضرورت مندوں پر خرچ کرے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا	ان کو بس اس بات کا حکم دیا گیا تھا
اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ	کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اپنے دین کو اس
وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ	کے لیے خالص کرکے یکسو ہو کر، نماز قائم کریں
وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝ (البینہ: ۵)	اور زکوٰۃ دیں۔ یہی مضبوط دین ہے۔

آیت میں اخلاص اور یکسوئی کے ساتھ عبادت کا حکم دینے کے بعد اس کی تشریح نماز اور زکوٰۃ سے کی گئی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کی پابندی ہی سے حق عبادت ادا ہوسکتا ہے۔ ان خوبیوں کے بغیر عبادت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بعض دوسرے مقامات پر عبادت کے ساتھ 'خیر' کا لفظ آیا ہے جو زیادہ جامع ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، رکوع
ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا	کرو، سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت
وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا	کرو اور خیر پر عمل کرو اس سے امید ہے
الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (الحج: ۷۷)	کہ تم فلاح پاؤ گے۔

یہاں عبادت سے پہلے رکوع، سجدہ یا یوں کہیے نماز کا حکم دیا گیا ہے اور

عبادت کے بعد 'خیر' پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔[1] حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں 'خیر' سے صلہ رحمی اور اعلیٰ اخلاق مراد ہے۔ یہ سارے اعمالِ خیر عبادت کے اندر آجاتے ہیں۔ ان کا الگ سے ذکر اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ان کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا جائے۔ اسی مقصد کے تحت عبادت سے الگ نماز کا بھی تذکرہ آیا ہے۔ حالانکہ اس کے عبادت بلکہ عینِ عبادت ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

قرآن مجید میں نماز، زکوٰۃ اور عملِ خیر کے بعد عبادت کا ذکر اس طرح بھی آیا ہے کہ اس کے دامن میں یہ تمام نیکیاں سمٹ آئی ہیں۔ ایک جگہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے خانوادہ کے بعض پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد ارشاد ہوا:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۚ (الانبیاء: ۷۳)	اور ہم نے ان کو امام بنایا۔ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ دکھاتے تھے۔ اور ہم نے ان پر وحی کی تھی نیک کاموں کے کرنے کی، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی۔ وہ ہمارے عبادت گزار (بندے) تھے۔

انسانوں کی خدمت اور بھلائی کے جو کام انجام دیئے جاتے ہیں ان کی عظمت اور برتری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کی عبادت بن جاتے ہیں۔

روزہ کا فدیہ

مالی عبادت بعض اوقات بدنی عبادت کا بدل بن جاتی ہے اور بدنی عبادت

[1] امام رازی اس قول کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ خیر پر عمل کی دو شکلیں ہیں 'ایک ہے'، اللہ تعالیٰ کی تعظیم بجالانا اور دوسری ہے اس کے بندوں کی خدمت کرنا۔ گویا نماز کے بعد عبادت کا وسیع تر حکم دیا گیا اس کے بعد خیر کا حکم ہے جو اس سے بھی زیادہ وسیع معنی اور مفہوم کا حامل ہے۔ تفسیر کبیر ۶/۲۰۸ قدیم ایڈیشن۔ اگر عبادت کے معنی صرف پرستش کے نہیں بلکہ پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری کے ہیں تو ـــــ

میں جو نقص اور کمی رہ جائے اس کی کبھی اس سے تلافی ہوتی رہتی ہے۔

نماز کی طرح روزہ ایک بدنی عبادت ہے جس میں انسان اللہ تعالیٰ کے لیے بھوکا پیاسا رہتا ہے اپنی خواہشات اور جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سلسلہ کا ایک ابتدائی حکم یہ ہے:

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○ (البقرہ: ۱۸۴)	اور جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہیں اور نہیں رکھتے ان کا فدیہ یہ ہے کہ مسکین کو کھانا کھلائیں۔ پھر جو کوئی خوشی سے زیادہ نیکی کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے روزہ رکھو تو یہ تمھارے حق میں بہت اچھا ہے اگر تم جانو۔

جو شخص روزہ رکھ سکتا تھا اسے بھی اس آیت کی رو سے اجازت تھی کہ روزہ نہ رکھے اور اس کے عوض کم از کم ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اس سے زیادہ مسکینوں کی خدمت کر سکے تو مزید باعثِ ثواب ہوگا البتہ اس کی پابندی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ روزہ رکھنا بہر حال بہتر ہے۔ بعد میں یہ اجازت منسوخ ہو گئی اور رمضان کے روزے سب پر فرض کر دیے گئے۔ البتہ مسافر اور مریض کو اجازت دی گئی کہ وہ چھوٹے ہوئے روزوں کی بعد میں قضا کر لیں۔ (البقرہ: ۱۸۵)

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی پابندی سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو اپنے بڑھاپے یا کسی سخت مرض کی وجہ سے روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ رکھتے ہوں ان کے لیے فدیہ کا حکم باقی رکھا گیا ہے اور ہدایت کی گئی کہ وہ ایک روزہ کے عوض ایک مسکین کو دونوں وقت کھانا کھلا دیں[1]

— اس کا دائرہ بھی خیر کے دائرہ کی طرح بہت وسیع ہو جائے گا۔ عبادت کے یہی وسیع معنی صحیح ہیں۔

[1] بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ البقرہ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ابن کثیر: تفسیر ۱/۲۱۴-۲۱۵

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ روزہ نہ رکھ سکتے ہوں ان کے لیے مال کا فدیہ اس کا بدل ہے۔ وہ مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کر کے روزہ کے فرض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔

روزہ اور صدقۂ فطر

رمضان کے روزوں کے بعد صدقۂ فطر رکھا گیا ہے اور اس کی علت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک روایت میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔

فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ الفطر طھرۃ للصیام من اللغو والرفث وطعمۃ للمساکین[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر فرض کیا ہے جو روزہ کو لغو حرکتوں اور ناپسندیدہ باتوں سے پاک کرتا ہے اور اس میں مسکینوں کی روزی ہے۔

روزوں میں اتفاق سے یا غیر شعوری طور پر کبھی نہ کبھی لغو اور بے ہودہ حرکتیں ہو ہی جاتی ہیں۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ صدقۂ فطر کے ذریعہ مسکینوں کی جو تھوڑی سی مدد ہوتی ہے اس سے ان کی آلائش دھل جاتی ہے اور وہ پاک اور صاف ہو جاتے ہیں۔

اس سلسلے کے بعض اور احکام یہاں بیان کیے جا رہے ہیں جن میں مالی عبادت کو بدنی عبادت کے مساوی یا اس کا بدل قرار دیا گیا ہے۔

حج میں جب فدیہ واجب ہوتا ہے

نماز اور روزہ کی طرح حج خالص بدنی عبادت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس میں مال بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے بدنی اور مالی عبادت کا ایک حسین امتزاج اس

---

[1] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب زکوٰۃ الفطر۔

میں پایا جاتا ہے اور وہ دونوں کی اہمیت ظاہر کرتا ہے لیکن مالی عبادت کے مقابلہ میں اس کا بدنی عبادت ہونا زیادہ نمایاں ہے۔ حج سے متعلق ارشاد ہے:

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (البقرہ:۱۹۶)

حج اور عمرہ اللہ کی رضا کے لیے پورا کرو۔ اگر تم راستہ میں روک دیئے جاؤ (بیماری یا راستہ کی خرابی کی وجہ سے) تو قربانی کا جو جانور میسر ہو اسے (یا اس کی قیمت) بھیج دو اور اس وقت تک اپنے سر نہ منڈواؤ (احرام نہ کھولو) جب تک قربانی کا جانور اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو (اپنا سر منڈوالے اور) اس کا فدیہ دے۔ روزہ یا صدقہ یا قربانی کا۔ پھر جب تم کو امن کی حالت نصیب ہو (خواہ درپیش خطرہ ٹل گیا ہو یا خطرہ پیش ہی نہ آیا ہو) اور جو عمرہ اور حج کو ساتھ ملا کر فائدہ اٹھائے تو جو قربانی میسر ہو وہ کرے۔ اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے دنوں میں رکھے اور سات روزے حج سے واپسی کے بعد یہ پورے دس روزے ہوئے۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جس کے اہل وعیال مسجد حرام کے پاس نہ ہوں (بلکہ وہ اپنی میقات سے باہر کا رہنے والا ہو) اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بڑا سخت عذاب دینے والا ہے۔

اس آیت میں حج سے متعلق جو احکام بیان ہوئے ہیں ان کی تفصیل میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ موضوعِ زیرِ بحث سے متعلق جو بات نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ کہ حالتِ احرام میں بال منڈوانا منع ہے۔ آیت میں فرمایا گیا ہے اگر کسی تکلیف کی وجہ سے بال منڈوانے پڑیں تو آدمی روزہ یا قربانی یا صدقہ کی شکل میں فدیہ ادا کر دے۔ اس میں مالی اور بدنی عبادتیں برابر ہو گئی ہیں۔ اسی طرح جو شخص حج میں تمتع یا قران کرے اسے قربانی کا حکم دیا گیا ہے اور قربانی کا جانور میسر نہ ہو تو دس روزے رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

ظہار سے رجوع کا طریقہ

عرب میں رواج تھا کہ لوگ بیوی سے ناراض ہوتے تو اسے ماں کے مثل قرار دے کر ازدواجی تعلقات ہمیشہ کے لیے توڑ لیتے تھے۔ اسے ظہار کہا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے اس بے ہودگی پر تنقید کی اور کہا کہ بیوی کبھی ماں نہیں ہو سکتی۔ اس سے رجوع کا طریقہ ان الفاظ میں بیان فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ (المجادلہ: ۲-۳)

جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں اور پھر اپنی اس بات سے رجوع کرنا چاہیں جو انھوں نے کہی تھی تو انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اس حکم کے ذریعہ تمھیں نصیحت کی جاتی ہے اللہ تم جو کچھ کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔ پس جو شخص غلام نہ پائے اسے پے در پے دو مہینوں کے روزے رکھنے ہوں گے قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

آیت میں ظہار سے رجوع کا طریقہ یہ بیان کیا گیا کہ پہلے بطور کفارہ ایک غلام آزاد کیا جائے، اس کی استطاعت نہ ہو تو لگاتار ساٹھ روزے رکھے جائیں اور یہ بھی نہ ہو سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔ اس کے بغیر بیوی سے تعلقات قائم نہیں ہو سکتے۔

قتلِ خطا کے احکام

اسی قسم کے احکام قتلِ خطا کے سلسلہ میں دیئے گئے ہیں۔ اسلامی مملکت میں کوئی مسلمان کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے تو اسے ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہوگا اور مقتول کی دیت بھی اس پر واجب ہو گی۔ اگر یہ مسلمان کسی ایسی ریاست کا فرد ہے جس سے اسلامی ریاست کی جنگ ہے تو صرف مسلمان غلام آزاد کیا جائے گا۔ دیت نہیں دی جائے گی (اس لیے کہ اس کے ورثاء محارب قوم کے افراد ہیں) ہاں اگر مقتول جس ریاست کا شہری ہے اس سے اسلامی ریاست کا معاہدۂ صلح ہو تو طے شدہ دیت بھی دی جائے گی اور ایک مسلمان غلام بھی آزاد کیا جائے گا۔ (مقتول مسلمان ہو یا کافر، عورت ہو یا مرد، غلام ہو یا آزاد اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا)۔ اس کے بعد فرمایا:

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ٥ (النساء: ٩٢)	اگر کوئی شخص غلام نہ پائے تو پے درپے دو مہینوں کے روزے رکھے۔ یہ اس گناہ پر توبہ کا طریقہ ہے اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

مقتول کی دیت تو قاتل اور اس کے خاندان والے ادا کریں گے۔ البتہ قاتل غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے مسلسل دو ماہ کے روزے رکھنے ہوں گے۔ بغیر کسی عذر شرعی کے وہ ان کا تسلسل نہیں توڑے گا[1]

[1] جو شخص روزے رکھنے کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو اس کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ وہ ساٹھ ـــ

قسم کا کفارہ

قسم کسی بات کی تاکید اور اپنے عزم کے اظہار کے لیے ہوتی ہے۔ اگر یہ چیز مقصود نہ ہو تو قسم کھانا بے معنی اور لغو ہوگا۔ اس کے توڑنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا البتہ کسی بات کو مستحکم کرنے کے لیے جو قسم کھائی جائے اس کے توڑنے کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ یہ کفارہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ (المائدہ: ۸۹)	اس کا کفارہ ہے دس مسکینوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑا پہنانا یا ایک غلام آزاد کرنا، جس شخص کو ان میں سے کسی کی طاقت نہ ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھے۔

ان تمام احکام میں غلام آزاد کرنے، مسکینوں کو کھانا کپڑا دینے اور قربانی کے ذریعہ غریبوں کی مدد کرنے کو بعض پہلوؤں سے روزہ کے مساوی حیثیت دی گئی ہے یا اسے ان کے بدل کے طور پر رکھا گیا ہے۔

خدا سے انسان کے تعلق کو قائم اور مضبوط کرنے میں بدنی عبادت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر کسی کو خدا کا قرب کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید نے خدمت خلق اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو بعض عبادات کا بدل قرار دے کر اور اس کے ذریعہ ان کی کمی کو دور کر کے اسے وہ مقام عطا کر دیا ہے کہ مذہب کے نظام میں اس سے بلند تر مقام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

— مسکینوں کو کھانا کھلائے گا، جیسا کہ ظہار کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے لیکن ایک دوسری رائے یہ ہے کہ یہاں صرف روزوں کا حکم دیا گیا ہے۔ جو شخص روزے نہ رکھ سکے اس کے بدل کے طور پر مسکینوں کو کھانا کھلانا اس کے لیے صحیح نہیں ہے۔ خازن تفسیر: ۱/۲۷۹ بغوی علی ہامش الخازن: ۱/۲۷۷

خدمت سب کی کی جائے

خود غرض افراد

اس دنیا میں آپ کو ایسے انسان بھی ملیں گے جن کے سامنے صرف اپنی ذات ہوتی ہے۔ وہ ہر کام میں اپنا مفاد دیکھتے ہیں، کسی دوسرے کے مفاد سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ وہ ہر ایک سے فائدہ تو اٹھانا چاہتے ہیں لیکن کسی کے کام آنا نہیں چاہتے۔ کسی کے دکھ درد اور مصیبت سے انھیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی اور اس کی خدمت کا جذبہ ان میں نہیں ابھرتا۔ اگر ابھرتا بھی ہے تو اسے مختلف بہانوں سے دبانے میں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے جیتے ہیں اور یہی اغراض زندگی بھر ان کی تگ ودو کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ ان سے کسی نفع کی توقع مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔

اسیرِ اہل و عیال

بہت سے لوگوں میں خدمت کا تو جذبہ ہوتا ہے لیکن نظر محدود ہوتی ہے۔ انھیں اپنی ذات کی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی بیوی بچوں، خاندان اور قبیلہ والوں سے تعلق خاطر ہوتا ہے لیکن یہی تعلق دوسرے وسیع تعلقات کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ ان کے سامنے صرف اپنے قریب ترین افراد کا مفاد ہوتا ہے، ان ہی کی فلاح و بہبود کے بارے میں وہ سوچتے ہیں اور ان ہی کی خدمت میں شب و روز لگے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ کسی کے سود و زیاں سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا اور انھیں فائدہ پہنچانے کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بھی وہ دریغ نہیں کرتے۔

اسلام نہ تو فرد کی اہمیت کم کرتا ہے اور نہ خاندان اور قبیلہ کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس نے دونوں کے حقوق اور ذمہ داریاں واضح کر دی ہیں، البتہ وہ خدمت اور بھلائی کا وسیع تصور دیتا ہے۔ وہ یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ انسان پر اس کی ذات اور اس کے خاندان ہی کے حقوق نہیں عائد ہوتے بلکہ وہ معاشرہ بھی اپنے حقوق رکھتا ہے جس کا وہ ایک فرد ہے۔ اس معاشرہ کی تعمیر امت کے تصور کے تحت ہوئی ہے۔[۱]

امت کی خدمت

اسلام کے ماننے والے تمام افراد ایک امت ہیں۔ ان کے درمیان دینی اخوت پائی جاتی ہے، خونی رشتہ کے بغیر بھی وہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ رنگ، نسل، زبان اور علاقہ کے اختلاف کے باوجود ان میں کا ہر فرد اپنے حقوق رکھتا ہے۔ وہ چاہے قرابت دار ہو یا نہ ہو، ہم سایہ ہو یا غیر ہم سایہ۔ مزدور اور کاریگر ہو یا تاجر اور صنعت کار، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل، اجنبی ہو یا شناسا، اس کے یہ حقوق محفوظ ہیں۔ اسے ان سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ان حقوق میں نصح و خیر خواہی، محبت اور ہمدردی، وقتِ ضرورت خدمت، مشکلات میں تعاون اور حسنِ سلوک داخل ہے۔ اس کی فضیلت ایک حدیث میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من نفس عن	جو شخص دنیا میں کسی مومن کی
مومن کُربۃً من	تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے
کُرَبِ الدنیا نفس	اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کی تکلیفوں
اللہ عنہ کربۃ	میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا، جو شخص
من کرب یوم القیامۃ	کسی مشکل میں پھنسے ہوئے آدمی کو آسانی
ومن یسّر علی معسرٍ	فراہم کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں

---

[۱] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اسی کتاب کا باب "غلط خیالات کی اصلاح"

يسّر الله عليه في الدنيا والآخرة والله في عون العبد ما كان العبد في عون اخيه ۔	اس کے لیے آسانی فراہم کرے گا۔ جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی ستر پوشی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے جب تک کہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

اس حدیث میں کسی مسلمان کی مشکلات میں کام آنے اور وقتِ ضرورت اس کے ساتھ تعاون کرنے کا اجر و ثواب بیان ہوا ہے۔ اسلام نے اس تعاون کو بڑی اہمیت دی ہے وہ پوری امت کو جسدِ واحد کی طرح باہم مربوط دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کے کسی بھی عضو کے درد کو پورا جسم محسوس کرے اور اسے دور کرنے کی کوشش کرے[۲]

اُمّت کے تصور سے قومیت کا جذبہ نہیں اُبھرتا

یہاں ایک خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح امت کے تصور کو ابھارنے اور اس کی خدمت اور فلاح و بہبود پر اس قدر زور دینے سے قومی جذبات نشو و نما پاتے ہیں اور انھیں تقویت ملتی ہے۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے اس لیے کہ قومی جذبات جہاں پرورش پاتے ہیں وہاں اس میں شک نہیں کہ قوم کا تشخص باقی رہتا ہے، بڑے پیمانہ پر اس کی خدمت اور اچھی طرح اس کے مفادات کی حفاظت ہوتی ہے لیکن اس سے قومی تعصب اور تنگ دلی بھی ابھرتی ہے۔ آدمی یہی نہیں کہ اپنی قوم کے مفاد کے سوا کسی دوسری قوم کے مفاد کے بارے میں نہیں سوچتا بلکہ اس کے خلاف اس کا ذہن کام کرنے لگتا ہے۔ قومیت کے تصور سے مختلف اقوام کے درمیان دوری

---

[۱] مسلم کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن

[۲] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ راقم کا مقالہ 'اہلِ ایمان کے باہمی تعلقات' مطبوعہ ماہنامہ 'زندگیِ نو' نئی دہلی۔ جنوری ۱۹۸۹ء

پیدا ہوئی ہے اور ان کے فاصلے بڑھے ہیں۔ مفادات کے تصادم نے عداوت اور دشمنی کی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ اسلام کے تصور امت سے قومیت کے جذبات ابھریں تو اس کی ستائش نہیں کی جا سکتی۔

یہ ایک بے بنیاد خیال ہے جس کا اسلام کے تصورِ امت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کسی قوم یا جماعت کے افراد کو اس بات کی ترغیب دینے سے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کریں، مشکلات میں کام آئیں اور آپس میں تعاون و ہمدردی کا رویہ اختیار کریں' اس کے اندر تعصب ہرگز نہیں پیدا ہو سکتا۔ یہ اس قوم کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا اور اس کی ایسی اخلاقی تربیت ہے جو کسی دوسرے فرد یا جماعت کے ساتھ ہمدردی اور حسنِ سلوک کی راہ میں مانع نہیں ہے۔ جس طرح آدمی اپنے خاندان اور قبیلہ کا ہمدرد ہوتے ہوئے پوری قوم کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اختیار کر سکتا ہے' اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کے اندر اپنی قوم کا بھی درد ہو اور وہ پوری نوع انسانی کے لیے بھی بے چین ہو۔

پوری نوع انسانی کی خدمت

اسلام اپنے ماننے والوں کو امت کا ہمدرد بنانے کے ساتھ تمام انسانوں کا بھی ہمدرد بناتا ہے۔ تعصب آدمی کو نفرت اور عداوت سکھاتا ہے۔ جو شخص قومی تعصب میں گرفتار ہو وہ اپنی قوم کے سوا کسی دوسری قوم کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا روادار نہیں ہوتا۔ اسلام اس کے سراسر خلاف ہے۔ اس کے نزدیک خدا کی مخلوق اس کا کنبہ ہے جو ان کی جتنی خدمت کرے وہ اس کا اتنا ہی محبوب ہے۔ حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الخلق کلھم عیال اللہ و	مخلوق ساری کی ساری اللہ کا کنبہ ہے
احبھم الیہ انفعھم لعیالہ[1]	اس میں وہ شخص اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے
	جو اس کے کنبہ کو زیادہ نفع پہنچائے۔

[1] رواہ ابویعلی والبزار باسناد ضعیف (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

قرآن مجید نے مسکینوں، محتاجوں، معذوروں، یتیموں اور وسائل سے محروم انسانوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا عام حکم دیا ہے۔ کہیں بھی اس نے یہ ہدایت نہیں کی کہ صرف مسلمانوں یا انسانوں کے کسی خاص گروہ اور جماعت کی خدمت کی جائے اور دوسروں کی نہ کی جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدمت پوری نوعِ انسانی کی ہو، اپنوں کی بھی اور غیروں کی بھی، ہم خیال اور ہم عقیدہ افراد کی بھی اور ان لوگوں کی بھی جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں، وہ بھی اس کے مستحق ہیں جو ہماری زبان بولتے ہیں اور وہ بھی جن کے اظہارِ خیال کا ذریعہ دوسری زبان ہے۔ نوعِ انسانی کا ہر فرد اس بات کا حق رکھتا ہے کہ آلام و مصائب میں اسے تنہا تڑپتے نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کے درد و کرب کو محسوس کیا جائے اور امکان کی حد تک اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لیے کہ رنگ، نسل، قوم اور وطن کے فرق کے باوجود ؎

بنی آدم اعضاء یک دیگر اند   کہ در آفرینش زیک جوہر اند

احادیث میں یہ حقیقت بہت نمایاں ہے۔ ذیل میں چند حدیثیں پیش کی جارہی ہیں۔

۱۔ حضرت جریر بن عبداللہ رضؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس [۱]	اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں فرماتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔

الراحمون یرحمھم الرحمٰن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء [۲]	رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتا ہے۔ (لہٰذا) زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) (التیسیر بشرح الجامع الصغیر) وعزاہ صاحب المشکوٰۃ الی البیہقی، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔

[۱] بخاری، کتاب التوحید، باب قل ادعوا اللہ الخ۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمۃ الصبیان والعیال الخ

[۲] ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ما جاء فی رحمۃ الناس۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لن تؤمنوا حتی تراحموا — تم ہرگز ایمان والے نہیں ہوگے جب تک کہ تم رحم نہ کرو۔

فرماتے ہیں ہم نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے ہر شخص رحم کرتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

انہ لیس برحمۃ احدکم صاحبہ ولکن رحمۃ الناس العامۃ[1] — اس سے وہ رحم اور ہمدردی مراد نہیں ہے جو تم میں سے کوئی اپنے قریب کے آدمی کے ساتھ کرتا ہے۔ یہاں اس رحمتِ عامہ کا ذکر ہے جو تمام انسانوں کے ساتھ ہوتی ہے۔

۴۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تنزع الرحمۃ الا من شقی[2] — رحم اور ہمدردی تو اسی شخص کے سینہ سے نکال دی جاتی ہے جو بدبخت ہو۔

۵۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس پہنچ کر فرمایا کہ کیا میں تمھیں بتاؤں کہ تم میں بھلا کون ہے اور برا کون؟ آپؐ کے اس سوال پر سب لوگ خاموش رہے، لیکن جب آپؐ نے تین مرتبہ یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ارشاد ہو ہم میں بھلا کون ہے اور برا کون؟ آپؐ نے فرمایا:

خیرکم من یرجی خیرہ ویؤمن شرہ — تم میں بہترین شخص وہ ہے جس سے خیر کی توقع کی جائے اور جس کے شر سے

---

[1] اخرجہ الطبرانی ورجالہ ثقات۔ فتح الباری: ۱۰/۳۳۰

[2] مسند احمد: ۲/۳۰۱۔ ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی رحمۃ الناس۔

وشرکم من لا یرجیٰ خیرہ ولا یؤمن شرہ [1]	لوگ محفوظ رہیں اور تم میں بدترین شخص وہ ہے جس سے خیر کی توقع نہ کی جائے اور جس کے شر سے لوگ محفوظ نہ رہیں۔

ان احادیث میں کسی فرق و امتیاز کے بغیر خدا کی ساری مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو شخص بھی ہماری ہمدردی اور مدد کا محتاج ہے اس کی مدد کی جانی چاہیے۔ اس معاملہ میں انسانوں کو گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم کرنا یا اپنے اور پرائے، شناسا اور اجنبی، ہم مذہب اور دوسرے مذہب والے کے درمیان فرق کرنا اور کسی کو خدمت اور حسنِ سلوک کا مستحق سمجھنا اور کسی کے اس حق کو تسلیم نہ کرنا اسلام کے مزاج اور اس کی ہدایت کے سراسر خلاف ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ان احادیث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ خدمتِ خلق کی اہمیت بیان کرتی ہیں، جو کام شب و روز کی عبادت کے برابر ہو، جس سے انسان خدا کا محبوب بن جائے، جو اسے خدا سے قریب کر دے، جس کی وجہ سے اس کی رحمت نازل ہو، جو سنگ دلی اور شقاوت جیسی اخلاقی خرابیاں دور کرنے کا ذریعہ ہو، جو اسے نیک اور صالح اور معاشرہ کا بہترین فرد بنا دے، اس کی عظمت و اہمیت سے ایک مسلمان کیسے انکار کر سکتا ہے؟ اس کے لیے اس میں اتنی بڑی ترغیب ہے کہ اس کے بعد وہ مزید کسی ترغیب کا محتاج نہیں رہتا۔

---

[1] مسند احمد: ۲/۳۶۸۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب بغیر عنوان۔

خدمت اور حسنِ سلوک کے یہ مستحق ہیں

اسلام کی یہ تعلیم گزشتہ صفحات میں وضاحت کے ساتھ آچکی ہے کہ معاشرہ میں جو بھی شخص خدمت کا مستحق ہو اس کی خدمت ہونی چاہیے، اس سے آگے اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ خدمت اور حسنِ سلوک کے مستحق کون ہیں؟ انسان کو ماں باپ، بیوی بچوں اور قرابت داروں سے فطری طور پر محبت ہوتی ہے۔ وہ ان سے ایک طرح کا قلبی تعلق محسوس کرتا ہے، اس وجہ سے ان کی خدمت کو اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے، لیکن معاشرہ کے دوسرے افراد سے اس طرح کی جذباتی وابستگی اسے نہیں ہوتی، اس لیے اس کا رویہ بھی ان کے سلسلہ میں مختلف ہوتا ہے۔ اسلام انسانوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت، ان کے درجات اور مراتب کی پوری رعایت کرتا اور ان کے حقوق کا تعین کرتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ان ہی افراد کی خدمت کو اپنا فرض نہ سمجھے جن سے اس کا خونی رشتہ ہے بلکہ وہ ان لوگوں کے ساتھ بھی بہترین سلوک کرے جن سے اس کا کوئی رشتہ اور قرابت نہیں ہے۔ اس کی خدمت اور حسنِ سلوک کا دائرہ اس کے گھر اور خاندان سے بڑھ کر پوری سوسائٹی تک پھیل جائے۔ وہ پوری نوعِ انسانی کو اپنا کنبہ سمجھ کر اس کی خدمت کے لیے کھڑا ہو جائے۔ سورۂ نساء کی ایک آیت بہت ہی اجمال کے ساتھ بتاتی ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو خدمت اور حسنِ سلوک کے مستحق ہیں اور جن سے غفلت اور بے توجہی برتی نہیں جاسکتی۔ وہ آیت یہ ہے

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا — اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ

تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا	کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ والدین کے
وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا	ساتھ حسن سلوک کرو۔ رشتہ داروں'
وَّبِذِي الْقُرْبٰى	یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ	(احسان کی روش اختیار کرو) پڑوسی
وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى	رشتہ دار' اجنبی پڑوسی' ہم مجلس' مسافر
وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ	اوران لوگوں کے ساتھ بھی جو تمھارے
بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ	قبضہ میں ہیں (حسن سلوک کرو) بے شک
وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ	اللہ پسند نہیں کرتا اس شخص کو جو
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ	اپنے پندار میں مبتلا ہو اور شیخی
كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ	بگھارتا ہو۔

(النساء: ۳۶)

اس آیت میں گو معاشرہ کے ان تمام کمزور اور محروم طبقات کا ذکر نہیں ہے جن کی خدمت کی قرآن تاکید کرتا ہے' البتہ اس سے اس کے ہمدردانہ اور محبت بھرے رویہ کو سمجھنے میں مدد ضرور ملتی ہے۔ یہاں ہم اس آیت کی مختصر سی تشریح کریں گے' لیکن اس سے پہلے یہ واضح کرنا مناسب ہوگا کہ خدمت کے لیے قرآن مجید نے 'احسان' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ بڑی جامع اصطلاح ہے جو خدمت کے سب ہی پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اس میں دل جوئی' محبت' ضروریات کا پورا کرنا اور کسی کو اس کے حق سے زیادہ دینا سب کچھ آجاتا ہے۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

آیت میں اللہ واحد کی عبادت کا حکم دینے کے بعد انسانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس ذیل میں سب سے پہلے والدین کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا	والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔

والدین کی خدمت کی تعلیم دنیا کے ہر مذہب نے دی ہے۔ قرآن مجید میں ایک دو نہیں بہت سے مقامات پر اللہ کی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ انسان پر سب سے زیادہ احسانات اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ اس کے بعد والدین کے احسانات ہیں۔ انسان کا وجود، اس کی پیدائش، پرورش، نگہداشت، تعلیم و تربیت اور اس کی معاشی و اخلاقی ترقی میں ماں باپ کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اگر ان کی توجہ نہ ہو تو وہ ترقی نہیں کر سکتا بلکہ اس کا وجود ہی خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔ جاہل سے جاہل اور نادار ماں باپ بھی اولاد کے لیے جو قربانی دیتے ہیں انسانی معاشرہ میں اس کی کوئی اور مثال نہیں دی جا سکتی۔ ان کے احسانات میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ خدا کی عبادت دراصل اس کے احسانات کا شکر ہے۔ ماں باپ کا درجہ خدا کا نہیں اس لیے ان کی عبادت تو نہیں ہو سکتی، البتہ ان کے ساتھ حسن سلوک ضروری ہے۔ یہی ان کے احسانات کا شکر ہے۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا بھی حکم دیا ہے اور والدین کا شکر ادا کرنے کی بھی ہدایت کی ہے۔ فرمایا:

اَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۚ إِلَيَّ الْمَصِيرُ (لقمان: ۱۴)	میرا شکر کر اور اپنے ماں باپ کا بھی شکر بجا لا۔ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔

موجودہ تہذیب نے خاندانی نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ اعلیٰ اخلاقی قدریں بھی ختم ہوتی جا رہی ہیں جو اس نظام سے وابستہ تھیں اس کا بڑا اثر بوڑھے ماں باپ پر پڑا ہے۔ آج باقاعدہ اس سوال پر غور ہو رہا ہے کہ ساٹھ ستر سال کے ان بوڑھوں کا کیا کیا جائے جو ہمارے لیے بے مصرف ہو چکے ہیں۔ جب وہ مستقبل کی تعمیر میں معاون نہیں ہیں تو ان کا بوجھ کب تک برداشت کیا جائے؟ حالاں کہ جن بوڑھوں کے بارے میں اس طرح سوچا جاتا ہے، انھوں نے موجودہ نسل کو اور اپنی اولاد کو اس وقت دریا برد نہیں کیا جب کہ وہ ان کے ہاتھوں میں مجبور و لاچار تھی اور ان کے رحم و کرم پہ جی رہی تھی۔ بلکہ اسے انھوں نے

اپنے خونِ جگر سے پالا پوسا اور زندگی کے میدان میں دوڑ دھوپ کے قابل بنایا۔ قرآن نے خاص طور پر بڑھاپے میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ فرمایا:

اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ○ (بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴)

اگر تمھارے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو تم انھیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو اور ان سے ادب اور احترام سے بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کرو کہ اے رب ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک

ارشاد ہے:

وَبِذِي الْقُرْبٰى — اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

قرآن مجید نے والدین کے فوراً بعد قرابت داروں کا یہاں بھی ذکر کیا ہے اور دوسرے مقامات پر بھی۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ والدین کے بعد قرابت داروں کا حق سب سے زیادہ ہے۔ ماں باپ سے قرابت داروں کی قرابت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اصل تو وہ ہیں پھر جو شخص ان سے جتنا قریبی تعلق رکھتا ہے اس کا حق بھی اسی قدر بڑھ جاتا ہے۔ قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک صلہ رحمی ہے۔ قرآن میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے۔ ایک جگہ اللہ والوں کی صفات ان الفاظ میں بیان کی گئی ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ — اللہ نے جن تعلقات کو جوڑنے کا

بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ؁ (الرعد: ۲۱)

حکم دیا ہے انھیں وہ جوڑتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔

صلہ رحمی سے پوری معاشرتی زندگی خوش گوار ہوتی ہے۔ جہاں یہ خوبی نہ ہو وہاں معاشرت میں بگاڑ آجاتا ہے۔ اس وجہ سے صلۂ رحمی کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

سلیمان بن عامرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

الصدقۃ علی المسکین صدقۃ و ھی علی ذی الرحم ثنتان صدقۃ وصلۃ[1]

کسی مسکین کو (جس سے رشتہ نہ ہو) صدقہ دینا محض ایک صدقہ ہے لیکن وہی صدقہ کسی رشتہ دار کو دیا جائے تو یہ صدقہ بھی ہے اور صلۂ رحمی بھی۔

مطلب یہ کہ رشتہ دار پر خرچ کرنا دوگونا ثواب کا باعث ہے۔ ایک پہلو سے یہ ایک عام صدقہ ہے جس طرح دوسرے صدقات ہیں۔ دوسرے پہلو سے یہ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان رشتہ داروں سے فطری طور پر قربت محسوس کرتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض رشتوں میں بڑی نزاکت پائی جاتی ہے۔ معمولی واقعات سے رنجشیں پیدا ہو جاتی ہیں اور تعلقات خراب ہونے لگتے ہیں۔ حدیث میں کہا گیا ہے کہ ان تعلقات کو بگڑنے نہ دیا جائے اور انھیں بحال رکھنے کی ممکنہ کوشش کی جائے۔ حسنِ سلوک اس کی ایک بہترین صورت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] ترمذی، ابواب الزکوٰۃ، باب ما جاء فی الصدقۃ علی ذی القرابۃ۔ نسائی، کتاب الزکوٰۃ، باب الصدقۃ علی الاقارب۔

لیس الواصل بالمکافی ولکن الواصل الذی اذا انقطعت رحمها وصلها[1]	صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں ہے جو رشتہ داروں کے ساتھ اس وقت صلہ رحمی کرے جب کہ وہ بھی اس کے ساتھ سلوک کریں بلکہ حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے جو اس وقت تعلقات کو جوڑے جب کہ وہ ٹوٹ جائیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے:

ان رجلا قال یا رسول اللہ ان لی قرابۃ اصلھم ویقطعونی واحسن الیھم ویسیئون الیّ واحلم عنھم ویجھلون علیّ فقال لان کنت کما قلت فکانما تسفھم الملّ ولا یزال معک من اللہ ظھیر مادمت علی ذالک[2]	ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے کچھ رشتہ دار ہیں ہیں تو ان سے صلہ رحمی کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ برا معاملہ کرتے ہیں۔ میں ان سے درگذر کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ جہالت کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ آپؐ نے یہ سن کر فرمایا۔ اگر تمھارا سلوک ایسا ہی ہے جیسا کہ تم نے بیان کیا تو گویا تم ان کے منہ میں گرم راکھ بھر رہے ہو اور جب تک تمھارا یہ رویہ رہے گا اللہ کی طرف سے ایک معاون تمھارے ساتھ رہے گا۔

یتیموں کے ساتھ حسن سلوک

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافی۔ ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی صلۃ الرحم۔

[2] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب صلۃ الرحم وتحریم قطیعتھا۔

والدین اور قرابت داروں کا حق سب پر مقدم ہے۔ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دینے کے بعد معاشرہ کے دوسرے ضرورت مند، محتاج اور کم زور افراد کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یتیموں اور مسکینوں کا ذکر کیا گیا ہے جو معاشرہ کے سب سے کم زور طبقات سے تعلق رکھتے ہیں ارشاد ہے:

وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ	اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔

جس معصوم بچے کے سر سے اس کے باپ کا سایہ اٹھ جائے وہ اس خلوص، محبت اور توجہ سے محروم ہو جاتا ہے جو اس کی پرورش، تعلیم و تربیت اور بسا اوقات معاشی ترقی اور استحکام کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے، اس لیے یہ معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ اس کی ضروریات پوری کرے اور اسے باپ سے محروم ہونے کا احساس نہ ہونے دے۔ معاشرہ کی غفلت سے یہی نہیں کہ اس کی ٹھیک سے نشو و نما نہیں ہوگی اور وہ جسمانی لحاظ سے کمزور ہوگا بلکہ اس کی صحیح ذہنی و فکری تربیت بھی نہیں ہو سکے گی۔ کوئی تعجب نہیں کہ ایسے سنگ دل اور بے رحم معاشرہ کے خلاف اس کے اندر بغاوت پرورش پانے لگے اور وہ ایک اچھا شہری بننے کی جگہ پورے معاشرے کے لیے نقصان دہ اور مضر ثابت ہو۔

قرآن و حدیث میں یتیموں کی پرورش، نگہداشت، تعلیم و تربیت، ان کے مال و جائداد کی حفاظت اور ان کے حقوق کی ادائیگی پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

کافل الیتیم لہ او لغیرہ انا وھو کھاتین فی الجنۃ واشار مالک بالسبابۃ والوسطیٰ [1]	یتیم کی کفالت کرنے والا چاہے وہ اس کا ہو یا کسی دوسرے کا (رشتہ دار ہو یا اجنبی) وہ اور میں جنت میں اس طرح قریب

[1] مسلم کتاب الزہد، باب فضل الاحسان الی الارملۃ الخ

ہوں گے جیسے میری یہ دو انگلیاں ہیں اسے حدیث کے راوی مالک نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کر کے دکھایا۔

یتیم اپنی کمزوری اور ناسمجھی کی وجہ سے اپنے جائز حقوق کی بھی حفاظت نہیں کر پاتا۔ اس کے حقوق پر قبضہ کرنا ہر کسی کے لیے آسان ہوتا ہے۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو سخت وعید سنائی ہے۔ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ۠ (النساء: ۱۰)

بے شک وہ لوگ جو یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

اسلام پورے معاشرہ پر یہ ذمہ داری ڈالتا ہے کہ وہ یتیموں کی نہ صرف پرورش کا نظم کرے بلکہ انھیں خدا ترس، با اخلاق اور شریف انسان بننے میں مدد دے تاکہ وہ معاشرہ پر بوجھ اور اس پر وبال بننے کی جگہ اس کے لیے سرمایہ بن سکیں۔

مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک

یتیموں کے ساتھ مسکینوں کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ مسکین سے مراد معاشرہ کے وہ افراد ہیں جو جسمانی معذوری اور مالی دقتوں کی وجہ سے اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے سے عاجز ہوں۔ جسمانی معذوری بھی معاشی دوڑ دھوپ کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے اور مالی دشواریاں بھی۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس رکاوٹ کو دور کیا جائے اور جو لوگ معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہوں ان کی ہر ممکن مدد کی جائے تاکہ ان کی ضروریات پوری ہوں اور ان کو معاشی استحکام حاصل ہو۔ قرآن و حدیث میں مسکینوں اور محتاجوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے اخلاقی اور قانونی حقوق کا بار بار ذکر کیا گیا ہے ایک جگہ حکم ہے:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ	رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین
الْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ	اور مسافر کو (اس کا حق) یہ بہتر ہے ان لوگوں
لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ	کے لیے جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور وہی
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الروم: ۳۸)	کامیاب ہونے والے ہیں۔

مسکین بالعموم بھیک مانگنے والے کو کہا جاتا ہے۔ بھیک مانگنا مجبوری اور بدحالی کی علامت نہیں ہے۔ جن لوگوں میں یہ مذموم عادت پیدا ہو جاتی ہے وہ بغیر کسی مجبوری کے بھی بھیک مانگتے ہیں انھیں مسکین نہیں، مسکین صورت کہنا چاہیے۔ اس کے برخلاف بعض لوگ سخت حاجت مند ہوتے ہیں لیکن ان کی خودداری اور عزتِ نفس اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کریں۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اس طرح کے حقیقی ضرورت مندوں کو دیکھا جائے۔ خاص طور پر ان لوگوں کو جو دین کی خدمت میں لگ جانے کی وجہ سے معاشی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے تان کے بارے میں اس نے کہا:

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ	ناواقف آدمی ان کے سوال نہ
اَغْنِيَاۗءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُھُمْ	کرنے کی وجہ سے انھیں خوشحال سمجھتا
بِسِيْمٰھُمْ ۚ لَا يَسْــَٔـلُوْنَ	ہے آپ ان کے چہروں سے انہیں پہچان
النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ	لیں گے۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال
(البقرہ: ۲۷۳)	نہیں کرتے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت میں ہمیں اس آیت کی تشریح ملتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَيْسَ المسكين	مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں
الذی يطوف على	کے درمیان دستِ سوال دراز کیے
الناس ترده اللقمة	گھومتا ہے۔ جسے دو ایک لقمے (یا کھانے
واللقمتان والتمرة والتمرتان	کی کوئی چیز مثلاً) دو ایک چھوہارے لوٹا

ولکن المسکین الذی لا یجد غنی یغنیه ولا یفطن له فیتصدق علیه ولا یقوم فیسأل الناس [1]	دیتے ہیں بلکہ مسکین تو وہ ہے جو بنیادی ضروریات کے بھی پورا کرنے کا سامان نہ ہونے کے باوجود اس طرح رہتا ہے کہ اس کی حالت کا پتہ نہیں چلتا کہ اسے صدقہ یا خیرات دی جائے اور نہ وہ کھڑا ہو کر کسی سے سوال کرتا ہے۔

اس طرح سوسائٹی کے ان شریف اور معزز افراد کی مدد کی طرف توجہ دلائی گئی جن کی معاشی پریشانیوں کا علم مشکل ہی سے ہوتا ہے اور جو سب سے زیادہ مدد کے مستحق ہوتے ہیں۔

پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

آیت میں پڑوسیوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ	رشتہ دار ہمسایہ، اجنبی ہمسایہ اور پاس بیٹھنے والے کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

انسان جن لوگوں کے درمیان رہتا ہے اور جو اس کے ہمسایہ ہیں اور جن سے وہ اپنی سماجی اور معاشرتی زندگی میں الگ تھلگ نہیں رہ سکتا ان کے حقوق ظاہر ہے ان لوگوں سے زیادہ ہیں جن سے اس کا اس نوعیت کا تعلق نہیں ہوتا۔ یہاں پڑوسی اور ہمسایہ کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک وہ جو ہمسایہ ہونے کے ساتھ رشتہ دار بھی ہے، دوسرا وہ جس سے صرف ہمسائیگی کا تعلق ہے۔ تیسرا وہ جس کا اتفاق سے یا کبھی کبھی ساتھ ہو جاتا ہے۔ جیسے سفر میں، دفتر اور آفس میں، اسکول اور کالج میں، کارخانہ

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب قول لا یسألون الناس الحافا۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب النهی عن المسئلہ

اور فیکٹری میں، تجارت اور کاروبار میں۔ جن لوگوں کے ساتھ اس طرح کا ساتھ ہو وہ بھی ایک طرح کے "ہمسایہ" ہیں۔ پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی اہمیت دنیا کے سب ہی مذاہب نے بیان کی ہے۔ لیکن اسلام نے پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم ہی نہیں دی بلکہ ہمسائیگی اور پڑوس کا اس قدر وسیع تصور دیا کہ دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس نے کہا کہ انسان کے ساتھ کسی بھی نوعیت کا تھوڑی بہت دیر کے لیے بھی ساتھ ہو جائے تو اس کا حق قائم ہو جاتا ہے۔ اگر یہ رفاقت مستقل ہو تو اس کا حق بھی بہت بڑھ جاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ دونوں سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مازال جبریل	حضرت جبریلؑ مجھے پڑوسی کے ساتھ
یوصینی بالجار	حسن سلوک کی اس قدر تاکید فرماتے تھے
حتی ظننت انہ	کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ وہ وراثت میں
سیورثہ[1]	اس کا حصہ مقرر کر دیں گے۔

اسلام صرف یہی نہیں چاہتا کہ پڑوسی کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی معاشی، اخلاقی ہر طرح کی مدد کی جائے اور اس کے ساتھ انتہائی شریفانہ رویہ اختیار کیا جائے تاکہ سوسائٹی کا ہر فرد اس یقین اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرے کہ وہ خیر خواہ انسانوں کے درمیان جی رہا ہے جن سے اسے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، وہ کسی بھی آڑے وقت میں اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑیں گے اور اس کے دکھ درد میں بھائیوں کی طرح کام آئیں گے۔ اس معاملہ میں اسلام کی ہدایات کا اندازہ ذیل کی دو حدیثوں سے ہو سکتا ہے۔

حضرت ابو سعید خزاعیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب الوصایۃ بالجار مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب الوصیۃ بالجار الخ

مرتبہ فرمایا، خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ شخص مومن نہیں ہے، آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ وہ شخص کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا :

الذی لا یأمن جارہ بوائقہ [1] — وہ شخص جس کے ضرر اور ناگہانی مصائب سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔

اس حدیث میں پڑوسی کو ایذا پہنچانے اور تکلیف دینے کو ایمان کے منافی قرار دیا گیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے۔

لیس المومن بالذی یشبع وجارہ جائع الی جنبہ [2] — وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود تو شکم سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے قریب بھوکا پڑا رہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی پہچان ہی یہ ہے کہ آدمی کا پڑوسی اس کی وجہ سے سکون محسوس کرے اور وہ اس کے دکھ درد اور مشکلات میں کام آئے۔

مسافروں کے ساتھ حسنِ سلوک

اس کے بعد ’ابن السبیل‘ کا ذکر فرمایا۔ ابن السبیل مسافر کو کہا جاتا ہے۔ اجنبیوں اور مسافروں کی خدمت کو ہمیشہ ایک کارِ ثواب سمجھا گیا، ان کے لیے سرائیں تعمیر کی گئیں اور ان کے کھانے پانی اور آسائش و راحت کا انتظام کیا گیا۔ اب خدمت کا جذبہ ختم ہو گیا ہے اور ان سب چیزوں کی جگہ بڑے بڑے عالی شان ہوٹلوں نے لے لی ہے۔ ان ہوٹلوں سے ایک تو ہر شخص کے لیے فائدہ اٹھانا آسان نہیں ہے، دوسرے

---

[1] بخاری کتاب الادب، باب اثم من لا یأمن جارہ بوائقہ ورواہ مسلم عن ابی ہریرۃ بمعناہ۔ کتاب الایمان، الحث علی اکرام الجار
[2] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب فی الشفقۃ علی الخلق بحوالہ بیہقی۔ الادب المفرد: ۱/۲۴ ورواہ الحاکم والطبرانی ورجال الطبرانی ثقات۔ التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۲/۳۲۱

یہ کہ ان سے مسافر کے سارے مسائل حل نہیں ہوتے۔ جو شخص وطن سے دور اور حالتِ سفر میں ہو وہ بہت سی مشکلات سے دوچار ہو سکتا ہے۔ روپیہ پیسہ کا نہ ہونا صحت کا خراب ہو جانا، قیام و طعام کی مناسب سہولتوں کا نہ ہونا، کاروبار اور دوسری ضرورتوں کے لیے دوڑ دھوپ میں زحمتوں کا پیش آنا ایک عام بات ہے۔ اگر سفر دوسرے ملک کا ہو تو آدمی بین الاقوامی قوانین کے تحت بعض دوسری قسم کی پریشانیوں میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو آج کے دور میں مسافر کے مسائل پہلے سے زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ اسلام پورے معاشرہ کی یہ ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ ایسے تمام مواقع پر مسافر کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کرے تاکہ وہ اجنبیت نہ محسوس کرے اور جس مقصد کے لیے اس نے گھر اور وطن چھوڑا تھا وہ سفر کی کلفتوں کی وجہ سے پورا ہونے سے نہ رہ جائے۔

غلاموں اور محکوموں کے ساتھ حسنِ سلوک

جو لوگ خدمت اور حسن سلوک کے مستحق ہیں ان میں غلاموں اور محکوموں کو خاص طور پر شامل کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ اور غلاموں سے حسنِ سلوک کرو۔

نزولِ قرآن سے بھی صدیوں پہلے سے غلامی کا رواج تھا۔ غلاموں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا اور ان کے کوئی حقوق نہیں تھے۔ قرآن غلامی کو ختم کرنا چاہتا ہے اس سلسلہ میں اس نے جو اقدامات کیے ہیں یہاں ان سے بحث کا موقع نہیں ہے، صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس سلسلہ کا پہلا قدم اس نے یہ اٹھایا کہ غلاموں اور محکوموں کے حقوق متعین کیے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی ہے۔ اس ذیل کی بہت سی حدیثوں میں سے صرف ایک حدیث یہاں پیش کی جارہی ہے۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ھم اخوانکم جعلھم اللہ	یہ غلام تمھارے بھائی ہیں جو خود کھاؤ
تحت ایدیکم فاطعموھم	وہی ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہی ان کو
مما تاکلون والبسوھم مما تلبسون	پہناؤ۔ ان کی طاقت سے زیادہ ان سے
ولا تکلفوھم ما یغلبھم فان	کام نہ لو۔ اگر طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ
کلفتموھم فاعینوھم [1]	ڈالو تو اس کے اٹھانے میں ان کی مدد کرو۔

حسنِ سلوک کے مستحق ان نمایاں افراد اور طبقات کے ذکر کے بعد آخر میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ	بے شک اللہ اس شخص کو پسند نہیں
مُخْتَالًا فَخُوْرًا	کرتا جو مغرور ہے اور شیخی بگھارتا ہے۔

اس میں مختالُ اور فخورُ دو لفظ آئے ہیں۔ یہ دونوں لفظ گو ہم معنی ہیں لیکن ان میں تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ مختال وہ ہے جس کے حرکت و عمل سے تکبّر اور گھمنڈ کا اظہار ہو۔ فخور اس شخص کو کہا جاتا ہے جو زبان سے شیخی بگھارتا اور بڑائی بیان کرتا پھرے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کو وہ شخص سخت ناپسند ہے جس کے گفتار و کردار سے تکبّر اور نخوت ٹپکتا ہو۔ تکبّر انسان کو اللہ کی عبادت اور بندوں کی خدمت دونوں ہی سے باز رکھتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں ہی اوصاف کی وجہ سے انسان کی انسانیت قائم ہے ورنہ وہ جانور سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

اخلاقی تعلیم کے ساتھ قانونی تحفظ بھی

اس موقع پر ایک خاص بات نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ کہ یہاں ماں باپ، خویش و اقارب، مسکینوں، محتاجوں اور معاشرہ کے دوسرے کم زور افراد اور طبقات سے اچھے سے اچھا اور بہتر سے بہتر سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ تعلیم مکہ سے لے کر مدینہ تک نزولِ قرآن کی پوری مدت میں مسلسل جاری

---

[1] بخاری، کتاب العتق، باب قول النبی ؐ العبید اخوانکم الخ مسلم، کتاب الایمان، باب صحبۃ الممالیک

رہی۔ اس طرح معاشرہ میں ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی، ہمدردی اور محبت کا مسلسل جذبہ پیدا کیا گیا اور کم زوروں، محروموں اور مستحقین کے حقوق پہچاننے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی پیہم ترغیب دی جاتی رہی۔ پھر ایک خاص مرحلہ میں اسلام نے ان سب کے حقوق متعین کیے اور انھیں قانونی تحفظ عطا کیا تاکہ کوئی شخص کسی کم زور پر دست درازی نہ کر سکے اور کوئی صاحب حق اپنے حق سے محروم نہ رہے۔

خدمتِ خلق کے طریقے بہت ہیں

اس دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو معاشرے کے کم زوروں، ناداروں اور محتاجوں کے ساتھ زبانی ہمدردی کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، لیکن ان کے ساتھ عملاً ہمدردی کرنے والے ذرا مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ معاشرہ کے جو افراد معاشی اور اقتصادی مشکلات میں گرفتار ہوں، انھیں زبانی ہمدردی سے زیادہ مالی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے لطف و محبت کے کلمات اور میٹھی باتوں سے وقتی طور پر انھیں تھوڑی سی قلبی راحت اور سکون چاہے مل جائے لیکن ان کی مشکلات دور نہیں ہو سکتیں۔

خدمت بذریعہ مال

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو بار بار ہدایت کی ہے کہ وہ انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود میں جی جان سے اپنا مال صرف کریں اور اسے ضائع اور رائیگاں نہ سمجھیں اس لیے کہ انسان کی جو دولت دوسروں کے کام آئے وہ اس کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس سے کل قیامت کے روز وہ اللہ تعالیٰ کے بے پایاں اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔ قرآن مجید عام طور پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ اور انفاق کا ذکر کرتا ہے تاکہ اس کی اہمیت دل میں بیٹھ جائے اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والا کوئی شخص اس سے غافل نہ ہونے پائے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو،

الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ٥ (البقرہ:۱۱۰)

اور تم جو نیک عمل بھی اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے (یعنی اس کی بہترین جزا) اللہ کے پاس پاؤ گے۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

سورۂ مزمل میں ارشاد فرمایا:

......وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (المزمل:۲۰)

......اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو اچھا قرض دو۔ تم جو نیک عمل بھی اپنے لیے آگے بھیجو گے تو اسے اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور زیادہ اجر والا پاؤ گے اور اللہ سے مغفرت طلب کرتے رہو۔ بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔

اہل ایمان کے مال میں محروموں کا حق ہے

قرآن مجید نے اہل ایمان کی جو تصویر کشی کی ہے اس میں ان کی یہ خوبی نمایاں نظر آتی ہے کہ ان کا مال ان کے اور ان کے متعلقین ہی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اس میں وہ معاشرے کے ناداروں، کمزوروں اور محروموں کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ اس نے خدا ترس انسانوں کا ایک وصف یہ بیان کیا ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ٥ (الذاریات:۱۹)

ان کے اموال میں حق ہے سائل اور محروم کا۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ٥ (المعارج:۲۴،۲۵)

ان کے اموال میں متعین حق ہے سائل اور محروم کا

انسانوں کے مال میں دور و نزدیک کے جن افراد کا حق ہے اور جن پر اس کا مال خرچ ہونا چاہیے اس کی کسی قدر تفصیل سورۂ بقرہ میں اس طرح بیان ہوئی ہے :

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ (البقرہ: ۲۱۵)

وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں (اور کہاں خرچ کریں) انھیں بتا دیجیے کہ تم جو بھی مال خرچ کرو، اس کے حق دار والدین، رشتہ دار، یتیم، مسکین اور مسافر ہیں۔ تم جو بھی بھلائی کرو گے اللہ اس سے واقف ہوگا۔

اس طرح اسلام نے حق داروں اور ضرورت مندوں پر مال خرچ کرنے کی تاکید بھی کی ہے اور اس کے اجر و ثواب کو بیان کرکے اس کی ترغیب بھی دی ہے[۱]

حسنِ سلوک

انسانوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر کیا جاتا ہے تو عام حالات میں ذہن اسی مالی تعاون کی طرف منتقل ہوتا ہے لیکن اسلام نے اس حقیقت کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے کہ کسی کی خدمت اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کے معنی یہی نہیں ہیں کہ اس کی مالی مدد کی جائے اور اس کی مادی ضرورتیں پوری کر دی جائیں بلکہ اس میں محبت، ہمدردی، دل جوئی اور وہ اعلیٰ اخلاقی رویہ بھی داخل ہے جو ایک شریف انسان دوسرے انسان کے ساتھ اختیار کرتا ہے اور جسے حسنِ سلوک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان اس دنیا میں اسی کا محتاج نہیں ہے کہ پیٹ بھرنے کے لیے اُسے دو وقت روٹی، تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا اور سر چھپانے کے لیے مکان مل جائے۔ اگر وہ بیمار پڑ جائے تو اُسے شفاخانے پہنچا دیا جائے بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ غریب اور نادار ہے تو اُسے حقیر اور ذلیل نہ تصور کیا جائے۔ اس کے ساتھ مساوات اور برابری کا برتاؤ کیا جائے۔ وہ بیمار ہے تو اس کی دوا دارو

---

[۱] اس پر مزید بحث مالی تعاون کے ذیل میں آرہی ہے ملاحظہ ہو باب۔ خدمت کے چند متعین پہلو۔

ہی کا انتظام نہ ہو بلکہ اس کی خدمت اور تیمارداری بھی کی جائے، اس میں کوئی خوبی ہے تو اس کا اعتراف کیا جائے، اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو عفو و درگزر سے کام لیا جائے، اس کی خوشی اور غم میں شرکت کی جائے اور ٹھوس مادی تعاون کے ساتھ گفتگو، میل جول اور تعلقات میں بھی اعلیٰ اخلاقی رویہ اختیار کیا جائے۔ قرآن مجید اور احادیث کی رو سے اس کے بغیر خدمت اور حسنِ سلوک کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔ اس کی ایک اچھی مثال یہ ہے کہ ماں باپ اسی کے محتاج نہیں ہوتے کہ اولاد ان کے کھانے کپڑے کا انتظام کر دے بلکہ وہ اولاد سے ایسی محبت اور ہمدردی کے بھی طالب ہوتے ہیں جو ان کے بڑھاپے کی کلفتوں کو دور کر دے۔ ان کو یہ احساس نہ ہونے دے کہ وہ معاشرے میں اکیلے، تنہا اور بے مصرف ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کی ضعیفی اور پیرانہ سالی کی رعایت کرے۔ ان کو اپنا بڑا مانے اور ان کے ساتھ تعظیم و توقیر سے پیش آئے۔ قرآن مجید نے اولاد کو ان کی معاشی کفالت کا حکم نہیں دیا بلکہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی جس میں معاشی کفالت بدرجۂ اولیٰ اور سب سے پہلے شامل ہو جاتی ہے[1] اب دیکھیے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا قرآن کے نزدیک تصور کیا ہے۔

اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ	والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے
الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَا	پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انھیں اُف
هُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ	تک نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان کے
وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا	ساتھ ادب تہذیب سے بات کرو اور ان

---

[1] فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے کہ آدمی کے والدین چاہے مسلمان ہوں یا کافر، ان کا نان و نفقہ اس پر واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافر والدین کے ساتھ بھی برتاؤ میں 'معروف' کی پابندی کا حکم دیا ہے (لقمٰن: ۱۵) اس کا تقاضا ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ 'لیس من المعروف ان یعیش فی نعم اللہ تعالیٰ ویترکھما جوعاً'۔ یعنی یہ کوئی نیکی اور معروف نہیں ہے کہ آدمی خود تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا رہے اور والدین کو بھوکا مرنے چھوڑ دے۔ ہدایہ: ج ۲ ص ۴۲۵-۴۲۶

قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴)

کے لیے دعا کرو کہ اے اللہ تو ان کے ساتھ اسی طرح رحم فرما جس طرح انھوں نے مجھے محبت اور ہمدردی سے بچپن میں پالا تھا۔

بعض اوقات ہمدردی کا ایک لفظ، محبت بھری ایک بات اور ایک کلمۂ خیر کی مادی تعاون سے زیادہ قدر و قیمت ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے شیریں کلامی اور حسنِ تخاطب کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک جگہ نماز اور زکوٰۃ سے پہلے اس کا ذکر کیا ہے۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ: ۸۳)

اور لوگوں سے اچھے طریقے سے بات کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

ایک غریب اور نادار شخص کی خدمت تو روپیہ پیسہ کے ذریعہ کی جاسکتی ہے لیکن جس کے پاس خود دولت ہو اسے ہمارے پیسہ کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ البتہ ہمدردی اور محبت اور اخلاقی رویہ کا محتاج ہر شخص ہے۔ اس سے نہ کوئی امیر بے نیاز ہوسکتا ہے نہ کوئی فقیر۔

خدمت کے بعض اور طریقے

احادیث میں اس پہلو کو بہت نمایا کیا گیا ہے کہ انسانوں کی خدمت روپیہ پیسہ ہی کے ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ کسی معذور کی مدد کرنا، کسی اندھے کو راستہ دکھانا، راستہ سے کوئی تکلیف دور کرنا، کسی کو پانی بھر کے دے دینا حتیٰ کہ کسی سے خندہ پیشانی سے ملنا اور حسن سلوک کرنا یہ بھی ان کی خدمت ہے اور روپیہ پیسہ خرچ کرنے کی طرح یہ بھی صدقہ ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

علی کل مسلم صدقة — ہر مسلمان پر صدقہ کرنا واجب ہے

قالوا فان لم یجد — اس پر صحابہؓ نے سوال کیا کہ اگر کسی کے پاس

قال فيعمل بيديه فينفع نفسه ويتصدق قالوا فان لم يستطع اولم يفعل قال فيعين ذا الحاجة الملهوف قالوا فان لم يفعل قال فليأمر بالخير اوقال بالمعروف قال فان لم يفعل قال فليمسك عن الشر فانه له صدقة[1]	صدقہ کے لیے کچھ نہ ہو تو کیا کرے؟ آپؐ نے فرمایا اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرے جو ملے اس سے خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں پر بھی خرچ کرے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس کی بھی طاقت نہ ہو تو کیا کیا جائے؟ آپؐ نے فرمایا کسی ضرورت مند اور مصیبت زدہ کی (مال کے علاوہ کسی اور طریقے سے) مدد کرے۔ عرض کیا گیا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کیا کیا جائے؟ ارشاد فرمایا کہ بھلائی کا حکم دے یا یہ فرمایا کہ معروف کا حکم دے۔ عرض کیا گیا کہ اگر کوئی شخص یہ بھی نہ کر سکے تو اس کے لیے کیا ہدایت ہے؟ فرمایا وہ برائی سے رک جائے یہ بھی اس کے لیے صدقہ ہے۔

اس حدیث کے ذیل میں محدثین نے بعض باتوں کی وضاحت کی ہے۔

مالی صدقات اہل ثروت کر سکتے ہیں لیکن صدقہ و خیرات مال کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اس کی اور صورتیں بھی ہیں۔ ان صورتوں پہ عام حالات میں بغیر زحمت کے ہر شخص عمل کر سکتا ہے۔ حدیث میں اعمالِ خیر کی ترتیب نہیں بیان ہوئی ہے بلکہ مثالوں سے مسئلہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ آدمی اعمالِ خیر میں سے ایک پر عمل نہ کر سکے تو دوسرے پر عمل کر سکتا ہے۔ جو شخص ان سب پہ عمل کر سکے اسے ضرور ان پہ عمل کرنا چاہیئے۔ اس حدیث سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ مال خرچ

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب کل معروف صدقہ۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب بیان ان اسم الصدقۃ یقطع کل نوع من المعروف

کرنے کی جہاں ضرورت ہو وہاں مال خرچ کرنا ہی افضل ہے۔ اس کی جگہ جن اعمال کا ذکر کیا گیا ہے ان کا درجہ اس کے بعد ہے۔ حدیث میں شر سے بچنے کو بھی صدقہ کہا گیا ہے اگر آدمی دوسرے کے ساتھ برائی کرنے سے باز رہے تو یہ اس پر صدقہ ہے، اگر اس شر کا تعلق خود اس کی اپنی ذات سے ہو تو یہ اس پر صدقہ ہے۔ حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ مخلوق کے ساتھ شفقت اور ہمدردی کا رویہ ہونا چاہیئے۔ یہ مال اور غیر مال دونوں ذریعہ سے ممکن ہے۔ مال کے ذریعہ مدد کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کے پاس مال موجود ہو اور وہ خرچ کرے۔ دوسرے یہ کہ اس کے پاس مال نہ ہو اور وہ محنت سے کما کر خرچ کرے۔ مال کے علاوہ جو مدد ہو گی اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ آدمی کسی کی تکلیف دور کرے گا یا اسے تکلیف پہنچانے سے باز رہے گا۔ حدیث کے الفاظ میں یہ سب وہ صدقات ہیں جو ایک انسان دوسرے پر کرتا ہے[1]

ہر خدمت صدقہ ہے

اس حدیث کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ خدمت کے تصور کے ساتھ عموماً بڑی بڑی خدمات ذہن میں آتی ہیں۔ ان کو ادا کرنے کا یارا ہر شخص اپنے اندر نہیں پاتا اور چھوٹی موٹی خدمات جنھیں انسان آسانی سے انجام دے سکتا ہے انھیں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس طرح نہ بڑی خدمات انجام پاتی ہیں اور نہ چھوٹی۔ حدیث میں اس ذہن کی اصلاح کی گئی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ نوع انسانی کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی جو خدمت بھی کی جا سکتی ہے، کی جانی چاہیئے۔ ہر خدمت صدقہ اور احسان ہے اور انسان اس پر اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ اس سلسلہ کی بعض حدیثیں یہاں پیش کی جا رہی ہیں۔

---

[1] فتح الباری: ۳/۱۹۸

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کل سلامی من الناس علیہ صدقۃ کل یوم تطلع فیہ الشمس۔	جب ہر روز سورج طلوع ہوتا ہے تو آدمی کے جوڑ جوڑ پر صدقہ واجب ہو جاتا ہے۔

لیکن صدقہ مال ہی کا نہیں ہوتا بلکہ اس کی اور صورتیں بھی ہیں۔ اس کی وضاحت آپؐ نے اس طرح فرمائی:

یعدل بین الاثنین صدقۃ ویعین الرجل علی دابتہ فیحمل علیھا او یرفع علیھا متاعہ صدقۃ والکلمۃ الطیبۃ صدقۃ وکل خطوۃ یخطوھا الی الصلوٰۃ صدقۃ ویمیط الاذی عن الطریق صدقۃ[1]	کوئی شخص دو آدمیوں کے درمیان انصاف کر دے یہ بھی صدقہ ہے، کسی کو جانور پر سوار ہونے میں مدد دے یہ بھی صدقہ ہے سواری پر کسی کا سامان رکھ دے یہ بھی صدقہ ہے۔ زبان سے اچھی بات کرے یہ بھی صدقہ ہے۔ اسی طرح نماز کے لیے جو قدم اٹھائے وہ بھی صدقہ ہے۔ راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کو دور کر دے یہ بھی صدقہ ہے۔

حضرت ابوذرؓ کی ایک روایت سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے فرماتے ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبسمک فی وجہ اخیک لک صدقۃ وامرک بالمعروف و نھیک عن المنکر لک صدقۃ وارشادک الرجل	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا صدقہ ہے، تمہارا معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا صدقہ ہے، تمہارا جنگل و بیابان میں جہاں راستہ کا پتہ نہ چلے، کسی کو راستہ دکھانا صدقہ ہے، تمہارا راستہ

---

[1] بخاری، کتاب الجہاد، باب اخذ الرکاب ونحوہ۔ مسلم کتاب الزکوٰۃ، باب ان اسم الصدقۃ یقع الخ

فی الارض الضلال لك صدقة واماطتك الاذی والشوك والعظم عن الطریق لك صدقة وافراغك من دلوك فی دلو اخیك لك صدقة[1]

سے گندگی، کانٹا اور ہڈی جیسی چیز اٹھا دینا صدقہ ہے، تمھارا اپنے ڈول سے پانی بھر کر اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا صدقہ ہے۔ یہ سب صدقات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا تمھیں ثواب ملے گا۔

ان حدیثوں میں انسانوں کی خدمت اور ان کی بھلائی کی بہت سی صورتیں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں کہ خدمت کا جذبہ ہو تو بڑی آسانی سے ان پر عمل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک روایت حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

کل معروف صدقة[2]

بھلائی کا ہر کام صدقہ ہے۔

یہ ایک جامع حدیث ہے جو خدمتِ خلق کی سب ہی شکلوں پر حاوی ہے۔ بنی نوع انسان کی جس شکل میں بھی خدمت کی جائے وہ اس پر صدقہ و احسان ہے اور خدمت کرنے والا اس کے اجر و ثواب کا مستحق ہے۔

صدقہ و خیرات کا کارِ خیر ہونا ہر شخص پر واضح ہے۔ اس کی اہمیت و افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انسانوں کی خدمت اور ان کی بھلائی کے ہر کام کو صدقہ قرار دے کر اس کی عظمت دلوں میں بٹھا دی گئی ہے۔ مزید ہدایت یہ کی گئی ہے کہ بھلائی کے کسی چھوٹے سے عمل کو بھی حقیر سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ خلقِ خدا کو جو فائدہ بھی پہنچایا جا سکتا ہے اس سے ہاتھ روک لینا صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا تحقرن من المعروف

بھلائی کے کسی کام کو حقیر ہرگز نہ سمجھو

---

[1] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی صنائع المعروف

[2] بخاری، کتاب الادب، باب کل معروف صدقة ورواه مسلم عن حذیفہؓ، کتاب الزکوٰۃ، باب ان اسم الصدقة یقع الخ

شیئاً ولو ان تلق اخاك بوجه طلیق[1]	اگرچہ وہ اپنے بھائی سے مسکرا کر تمھارا ملنا ہی کیوں نہ ہو۔

انسانوں کی خدمت جس پہلو سے اور جتنی کچھ بھی ہو سکتی ہے ضرور کی جانی چاہیے۔ یہ عذاب جہنم سے نجات کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم کی ہولناکی کا ذکر کیا اس سے پناہ مانگی اور ارشاد فرمایا:

اتقوا النار ولو بشق تمرة فان لم یکن فبکلمة طیبة[2]	جہنم سے بچو، اگر کچھ نہ ہو تو چھوہارے کا ایک ٹکڑا صدقہ کر کے ہی سہی۔ یہ بھی نہ ہو تو زبان سے اچھی بات کر کے ہی اس سے بچو۔

جب کسی مستحق کی مدد کی جاتی ہے تو وہ ایک طرح کی فرحت اور راحت محسوس کرتا ہے، اسی طرح خوش کلامی بھی مسرت اور خوشی کا باعث ہوتی ہے اس لیے دونوں ہی صدقہ کی صورتیں ہیں[3]۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی خدمت اور ان کے ساتھ خیر خواہی کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ہر شخص اس محاذ پر اپنا حق ادا کر سکتا ہے اور اسے فی الواقع ادا کرنا چاہیئے۔ اس کے لیے نہ تو صاحبِ ثروت ہونا ضروری ہے اور نہ حکومت و ریاست کے تعاون ہی کی حاجت ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ دولت و ثروت یا حکومت و ریاست کے ذریعہ صرف چند گوشوں میں انسانوں کی خدمت ہو سکتی ہے۔ بہت سے گوشے وہ ہیں جہاں فرد کا اعلیٰ اخلاق اور بلند کرداری کام آ سکتا ہے۔ حکومت و ریاست کسی معذور کو وظیفہ، کسی بے روزگار کو روزگار، کسی بے گھر کو مکان اور کسی مریض کو طبی امداد تو فراہم کر سکتی ہے لیکن اپنے تمام وسائل کے باوجود ماں باپ، بیوی، بیٹے، بھائی، دوست، ہم سایہ اور شریف شہری کا بدل نہیں بن سکتی۔ جو جذباتی سکون اور اعلیٰ سلوک اس کو ان افراد سے مل سکتا ہے وہ ریاست کے کسی چھوٹے بڑے ادارہ سے نہیں مل سکتا۔

---

[1] مسلم، کتاب البر والصلة، باب استحباب طلاقة الوجه عند اللقاء۔

[2] بخاری، کتاب الادب، باب طیب الکلام۔ مسلم، کتاب الزکوٰة، باب الحث علی الصدقة ولو بشق تمرة۔ الخ

[3] فتح الباری: ۱۰/۳۲۵

وقتی خدمت کی اہمیت اور فضیلت

بندگانِ خدا کی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی ایک صورت یہ ہے کہ ان کی وقتی اور ہنگامی ضروریات پوری کی جائیں۔ بعض اوقات انسان وقتی اور ہنگامی مدد کا سخت محتاج ہوتا ہے۔ اس میں تھوڑی سی غفلت بھی اسے شدید نقصان پہنچا سکتی ہے۔ کبھی مدد کرنے والا بھی وقتی طور ہی پر کچھ مدد کرنے کے قابل ہوتا ہے اس سے زیادہ کی اس کے اندر وسعت اور گنجائش نہیں ہوتی۔ اسلام نے اس نزاکت کو محسوس کیا ہے۔ اس نے ایک طرف ترغیب دی ہے کہ خدا کے جس بندہ کو جس وقت جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو وہ فراہم کی جائے، دوسری طرف تاکید کی ہے کہ آدمی کسی ضرورت مند کی وقتی طور پر تھوڑی بہت جو کچھ بھی مدد کر سکتا ہو اس سے دریغ نہ کرے۔

یہاں وقتی اور ہنگامی تعاون کی بعض صورتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

کھانا کھلانا

وقتی مدد کی ایک شکل بھوکے کو کھانا کھلانا ہے۔ جو شخص بھوک سے تڑپ رہا ہو، اس کا حق ہے کہ اس کی بھوک فوراً مٹائی جائے۔ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی، جو جنت کی ابدی نعمتوں کے حق دار ہوں گے، تعریف کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا ہے:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ — وہ کھانے کی خواہش اور ضرورت کے

عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ○ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا ○ (الدہر)	باوجود اسے مسکین یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں اور (کہتے ہیں) کہ ہم تو صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے تمھیں کھلاتے ہیں۔ ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کا ڈر لگا ہوا ہے جو بہت سخت اور غصہ سے بھرا ہوا ہوگا۔

کسی بھوکے کو کھانا کھلانے کی فضیلت میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ یہاں صرف دو ایک حدیثوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا:

اَیُّ الاسلام خیر ؟ — بہترین اسلام کیا ہے ؟

یہاں سوال نمایاں اسلام کی ان نمایاں خصوصیات کے بارے میں تھا جن کا تعلق انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود سے ہے۔ اس کے جواب میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

تطعم الطعام وتقرئ السلام علی من عرفت ومن لم تعرف[1]	یہ کہ تم کھانا کھلاؤ اور جاننے اور نہ جاننے والوں دونوں ہی کو سلام کرو۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو میں حاضر ہوا۔ جوں ہی چہرہ مبارک پر نظر پڑی میں سمجھ گیا کہ یہ کسی جھوٹے انسان کا چہرہ نہیں ہے۔ پہلی بات جو آپؐ نے اس وقت فرمائی وہ یہ تھی۔

یاایھا الناس افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا الارحام وصلوا باللیل والناس	اے لوگو! سلام کو رواج دو اور اسے پھیلاؤ، بھوکوں کو کھانا کھلاؤ، رشتوں کو جوڑو، رات میں جب کہ لوگ سو رہے ہوں نماز پڑھو امن و سلامتی کے ساتھ جنت

---

[1] بخاری کتاب الایمان باب اطعام الطعام من الاسلام مسلم کتاب الایمان باب تفاضل الاسلام وای امورہ افضل

نیام تدخلوا الجنۃ بسلام[1] میں داخل ہو جاؤ گے۔

بھوکوں کو کھانا کھلانا بظاہر ایک چھوٹی سی خدمت ہے، لیکن کسی معاشرہ میں اس کی اہمیت کا احساس پیدا ہو جائے تو کوئی بھی شخص بھوک پیاس برداشت کرنے پر مجبور نہ ہوگا بلکہ ایسا معاشرہ فقر و فاقہ کا بہت آسانی سے اور بہت جلد علاج ڈھونڈ نکالے گا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے ابتدائی دور میں جب کہ اسلامی ریاست کی معیشت بہت زیادہ مستحکم نہیں تھی، بھوک اور افلاس کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اور طریقوں کے ساتھ یہ طریقہ بھی اختیار فرمایا تھا۔ چنانچہ بھوکوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:

طعام الاثنین کافی	دو آدمیوں کا کھانا تین کے لیے کافی
الثلاثۃ و طعام الثلاثۃ	ہے اور تین آدمیوں کا کھانا چار کے لیے
کافی الاربعۃ[2]	کفایت کرتا ہے۔

یہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت میں اس سے آگے کی بات کہی گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

طعام الواحد یکفی	ایک آدمی کا کھانا دو کے لیے کافی
الاثنین و طعام الاثنین	ہے اور دو آدمیوں کا کھانا چار کے لیے کافی
یکفی الاربعۃ و طعام الاربعۃ	ہے اور (اسی طرح) چار آدمیوں کا کھانا
یکفی الثمانیۃ[3]	آٹھ کے لیے کافی ہے۔

اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت عمرؓ سے بھی مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الزکوٰۃ، باب فی فضل الصدقۃ، بحوالہ ترمذی، ابن ماجہ، دارمی۔ اس سلسلہ کی مزید احادیث کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون "کمزور۔ اسلام کے سایہ میں"، مطبوعہ ماہنامہ زندگی رام پور، اگست، ستمبر ۱۹۶۷ء

[2] بخاری، کتاب الاطعمۃ، باب طعام الواحد یکفی الاثنین۔ مسلم، کتاب الاشربۃ، باب فضیلۃ المواساۃ فی الطعام الخ

[3] مسلم حوالہ سابق۔ ابن ماجہ، ابواب الاطعمۃ، باب طعام الواحد یکفی الاثنین

نے فرمایا:

ان طعام الواحد یکفی الاثنین وان طعام الاثنین یکفی الثلاثة والاربعة وان طعام الاربعة یکفی الخمسة والستة[1]	ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے لیے کفایت کرتا ہے اور دو آدمی کا کھانا تین اور چار کے لیے کافی ہے اور چار آدمیوں کا کھانا تو پانچ اور چھ کے لیے کافی ہے۔

ان روایات میں بظاہر دو مختلف باتیں کہی گئی ہیں، لیکن ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پہلی حدیث میں کہا یہ گیا ہے کہ جو کھانا دو آدمی سیر ہو کر کھا سکتے ہیں، اس سے تین آدمیوں کی ضرورت بآسانی پوری ہو سکتی ہے۔ بعد کی دو حدیثوں میں بتایا گیا ہے کہ ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے لیے کفایت کر سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس سے دونوں کو قوتِ حیات فراہم ہو سکتی ہے اور دونوں زندہ رہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے ان سب باتوں کا تعلق اشخاص اور حالات سے ہے۔ ان احادیث میں اصلاً جس بات کی ترغیب دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے کھانے میں دوسرے بھوکے انسانوں کو شریک کرے اور یہ یقین رکھے کہ جو کچھ موجود ہے اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائے گا اور سب کی ضرورت پوری ہو گی۔

مسکینوں کی مدد کرنے اور بھوکوں کو کھانا کھلانے کا جذبہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا فرما رہے تھے، اس کا اندازہ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے ہوتا ہے۔ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ ایک بکری ذبح ہوئی اور تقسیم ہو گئی۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ کچھ گوشت بچا بھی ہے۔ میں نے عرض کیا۔ سوائے ایک شانے کے کچھ نہیں بچا ہے۔ سب خیرات کر دیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا نہیں! سب کچھ باقی ہے سوائے ایک شانہ کے[2] مطلب یہ کہ جو صدقہ کر دیا گیا اس کا اجر و ثواب تو محفوظ ہو گیا اس

---

[1] ابن ماجہ حوالہ سابق

[2] ترمذی، ابواب صفة القیامة ۲/۷۰، مسند احمد ۶/۵۰۔

کے بارے میں یہ کیوں سمجھا جائے کہ وہ ختم ہوگیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں قربانی کا گوشت خشک کرکے کافی دنوں تک استعمال کرنے کا رواج تھا۔ قحط کے زمانے میں آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ تین دن سے زیادہ گوشت نہ رکھا جائے۔ اس کی وجہ حضرت عائشہؓ ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔

اراد ان یطعم الغنی الفقیر[1]	آپؐ یہ چاہ رہے تھے کہ جو صاحبِ حیثیت ہیں وہ فقراء کو (یہ گوشت) کھلائیں۔

مسکینوں کو کھانا کھلانا بعض صحابہ کرامؓ کا ایک محبوب عمل تھا، اس سے انھیں کتنی دلچسپی تھی اور اس کا وہ کس قدر اہتمام فرماتے تھے اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے ہوسکتا ہے۔

حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کسی مسکین کو کھانے میں شریک کیے بغیر کھانا تناول نہیں فرماتے تھے[2]

حضرت صہیبؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ غریبوں کو کھانا بہت کھلایا کرتے تھے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے تنقید کی تو انھوں نے فرمایا :

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول خیارکم من اطعم الطعام ورد السلام فذالک الذی یحملنی علیٰ ان اطعم الطعام[3]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو غریبوں کو کھانا کھلائے اور سلام کا جواب دے۔ آپؐ کی یہی بات مجھے کھانا کھلانے پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الاطعمۃ، باب ما کان السلف یدخرون فی بیوتہم واسفارہم۔

[2] 〃 〃 〃، باب المؤمن یاکل فی معی واحد۔

[3] مسند احمد ۶/۱۶

اس سلسلہ کا ایک بہت ہی مؤثر واقعہ ہمیں حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے جس سے بڑی عبرت اور نصیحت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ فقر و فاقہ اور مصیبت میں گرفتار ہوں آپؐ نے ازواجِ مطہراتؓ میں سے ایک کے گھر سے اسے کھلانے کے لیے کچھ منگوایا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اس وقت سوائے پانی کے کچھ نہیں ہے۔ پھر آپؐ نے دوسری زوجہ مطہرہؓ کے گھر بھیجا، وہاں سے بھی یہی جواب آیا۔ اسی طرح باری باری سب ہی ازواج کے ہاں سے یہی اطلاع ملی کہ اس وقت کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔ آپؐ نے حاضرین سے فرمایا کہ کون اسے کھانا کھلائے گا اللہ اس پر رحم فرمائے۔ یہ سُن کر ایک انصاری نے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ حضرت ابوطلحہؓ تھے، فرمایا کہ میں یہ خدمت انجام دے سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ بیوی سے پوچھا کہ تمھارے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے؟ اس نے عرض کیا کہ صرف بچوں کا کھانا ہے انھوں نے کہا کہ بچوں کو بہلا کر سُلا دو۔ جب کھانا دسترخوان پر لگ جائے تو چراغ کو ٹھیک کرنے کے بہانہ اسے بجھا دو اور اس طرح ظاہر کرو جیسے ہم بھی کھا رہے ہیں چنانچہ بیوی نے اس پر عمل کیا اور چراغ بجھا دیا۔ اندھیرے میں میاں بیوی دونوں ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کھانے میں شریک ہیں۔ چنانچہ مہمان نے تو کھانا کھا لیا اور یہ دونوں رات بھر بھوکے رہے۔ صبح رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچے۔ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تم دونوں کے رات کے عمل سے بہت خوش ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (یعنی یہ آیت ایسے ہی موقع کے لیے ہے۔)

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ فَأُولَٰٓئِكَ	وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے، وہی فلاح

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (الحشر: ۹) پانے والے ہیں۔

کھانا کھلانے میں تعاون

کسی غریب کو کھانا کھلانے میں بیوی اور خادم کی طرف سے جو تعاون ملتا ہے اس کا انھیں بھی اجر ملے گا۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا اطعمت المرأۃ من	جب عورت اپنے شوہر کے گھر سے
بیت زوجھا غیر مفسدۃ فلھا	نقصان پہنچائے بغیر کھانا کھلاتی ہے تو
اجرھا ولہ مثلہ وللخازن	اسے اس کا اجر ملے گا۔ اسی کے مثل شوہر
مثل ذالک[۲]	کو اجر ملے گا اور خازن کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا۔

خازن کے سلسلہ میں ایک اور حدیث اسی مفہوم کی آتی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

الخازن المسلم الذی	جو مسلمان خازن اس حکم کو نافذ کرتا
ینفذ وربما قال	ہے جو اسے دیا گیا ہے۔ بسا اوقات آپ
یعطی ما امر بہ	نے یوں فرمایا کہ جس چیز کے دینے کا اسے حکم
کاملا موفرا طیبۃ	دیا گیا ہے وہ دیتا ہے۔ پورا پورا دیتا ہے
نفسہ فیدفعہ	اور خوش دلی سے دیتا ہے، جس شخص
الی الذی امر بہ	کے حوالہ کرنے کے لیے اسے کہا گیا ہے اس
احد المتصدقین۔	کے حوالہ کرتا ہے تو وہ بھی صدقہ کرنے والوں

---

[۱] بخاری، کتاب فضائل اصحاب رسول اللہؐ، باب قول اللہ عزوجل ویؤثرون علی انفسھم الخ۔ مسلم، کتاب الاشربۃ، باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ۔

[۲] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب اجر المرأۃ اذا تصدقت واطعمت الخ۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اجر الخازن الامین والمرأۃ .....

''میں سے ایک ہے'' [1]

آدمی کی بیوی ہو یا خادم یا اس کا گماشتہ اور امین' اس کی اجازت ہی سے اس کا مال خرچ کر سکتے ہیں اجازت کے بغیر انھیں اس کے مال میں تصرف کا حق نہ ہوگا. لیکن اجازت صراحت کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے اور عرف اور رواج کے تحت بھی۔ اگر یہ بات متعارف ہو کہ ایک خاص حد کے اندر غریبوں کی مدد کرنے یا انھیں کھلانے پلانے میں شوہر کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا تو بیوی اس حد تک عمل کر سکتی ہے۔ اگر اعتراض کا اندیشہ ہو تو اسے احتیاط کرنی چاہیے۔

یہ تو ایک قانونی بات ہے۔ ورنہ آدمی کو اتنا فراخ دل ہونا ہی چاہیے' کہ بیوی یا وہ خادم جس پر اسے اعتماد ہو اگر اس کے مال سے کسی مسکین کی مدد کر دے تو وہ فرحت اور خوشی محسوس کرے کہ ایک کار خیر میں انھوں نے اس کی مدد کی۔ اس سے وہ خود بھی اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔

ایک صحابی جن کا لقب ابی اللحم تھا' کہتے ہیں کہ میں اپنے آقا کے حکم سے گوشت کے پارچے بنا رہا تھا۔ اتنے میں ایک مسکین آیا تو میں نے اسے کچھ گوشت دے دیا۔ میرے مالک کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے مجھے مار دیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے انھیں بلا کر مارنے کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے عرض کیا کہ اس نے میری اجازت کے بغیر میری چیز دوسروں کو دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا ''الاجر بینکما'' یعنی اجر تم دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا۔ [2] یعنی تم دونوں کو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اجر ملے گا۔ غلام نے یہ سمجھ کر صدقہ کیا تھا کہ مالک کو اس پر اعتراض نہ ہوگا اس لیے وہ بھی اجر کا مستحق ہوگا۔ مالک کا مال چونکہ خرچ ہوا اس لیے وہ بھی اجر کا مستحق ٹھہرا۔

---

[1] مسلم' کتاب الزکوٰۃ' باب اجر الخازن الخ

[2] مسلم' حوالہ سابق

پانی پلانا

پانی انسان کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ نعمت چونکہ بڑی فراوانی کے ساتھ عطا کی ہے اس لیے اس کی قدر و قیمت محسوس نہیں کی جاتی جس شخص کے حلق میں پیاس سے کانٹے پڑ رہے ہوں اس کے لیے اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ بروقت اسے دو گھونٹ پانی مل جائے۔ اسلام کے نزدیک جس طرح بھوکے کو کھانا کھلانا باعث ثواب ہے اسی طرح پیاسے کو پانی پلانا بھی ثواب کا باعث ہے۔ ایک حدیث شریف میں آتا ہے۔

ایما مسلم سقی مسلما علیٰ ظمأ سقاہ اللہ من الرحیق المختوم[1]

جو مسلمان کسی مسلمان کو اس کی پیاس کے وقت پلائے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اسے وہاں کی مہربند شراب پلائے گا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک شخص بیابان میں چلا جا رہا تھا کہ اسے سخت پیاس لگی۔ اسی حالت میں اس نے ایک کنواں دیکھا تو اتر کر پانی پیا۔ جب خوب سیراب ہو کر باہر آیا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے زبان نکالے ہوئے زمین کی نمی چاٹ رہا ہے۔ اس شخص نے دل میں سوچا کہ جس طرح پیاس سے ابھی میں تڑپ رہا تھا اسی طرح یہ کتا بھی تڑپ رہا ہے۔ وہ فوراً کنویں میں اترا اور اپنے موزے میں پانی بھر کر لایا اور اس بے زبان جانور کو پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی قدر کی اور اسے معاف فرما دیا۔ اس پر صحابہ کرامؓ نے دریافت فرمایا۔ کیا جانوروں کی خدمت میں بھی ثواب ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔

---

[1] ابو داؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی فضل سقی الماء۔ ترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ باب ۲/۲۸

فی کل کبد رطبۃ اجر لہ — ہر تر و تازہ جگر (زندہ مخلوق) کی خدمت میں اجر و ثواب ہے۔[1]

ایک روایت میں اسے بنو اسرائیل کی ایک زانیہ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی وجہ سے اس کی مغفرت فرما دی۔[2]

ایک شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اہم امور خیر کی ہدایت فرمائی اس کے بعد ارشاد فرمایا:

فان لم تطق ذالک فاطعم الجائع واسق الظمآن[3] — اگر تم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور پیاسے کو پانی پلاؤ۔

کھانے کی تیاری میں جزوی مدد کرنا

کھانے کے تیار کرنے میں آٹا، چاول، دال، گوشت، سبزی، نمک پانی، اور ایندھن وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ خدمت کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ بعض غذائی اشیاء کے ذریعہ مدد کی جائے یا ایندھن فراہم کیا جائے۔ اس کی بھی فضیلت ہے۔ ان میں سے بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ ان سے منع کرنا ہی نہیں چاہیے۔ وہ انسان ہی کیا جو کسی کی نمک اور پانی کی ضرورت بھی پوری نہ کرے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا اے اللہ کے رسولؐ! وہ کیا چیز ہے جس سے منع کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ پانی، نمک اور آگ۔ میں نے عرض کیا کہ پانی کی اہمیت سے تو ہم سب واقف ہیں لیکن نمک اور آگ کی کیا اہمیت ہے؟ آپؐ

---

[1] بخاری، کتاب المساقات، باب فضل سقی الماء۔ مسلم، کتاب قتل الحیات وغیرہا، باب فضل سقی البہائم الخ

[2] مسلم حوالہ سابق

[3] قال المنذری رواہ احمد۔ ۴/۲۹۹ وابن حبان فی صحیحہ البیہقی وغیرہ۔ الترغیب والترہیب۔

نے فرمایا۔ اے حمیرا (حضرت عائشہ رضؓ کا لقب) جس نے کسی کو آگ فراہم کی، گویا اس نے اس پورے کھانے کا صدقہ کیا جو اس آگ سے تیار ہوا ہے۔ جس نے نمک دیا اس نے گویا اس پورے کھانے کا صدقہ کیا جو اس نمک کی وجہ سے لذیذ اور مزے دار ہوا ہے۔ جس نے کسی مسلمان کو کسی ایسی جگہ پانی پلایا جہاں کہ پانی دست یاب ہی نہیں تھا تو گویا اس نے اسے زندہ کیا۔[1]

لباس فراہم کرنا

انسان کی بنیادی ضروریات میں غذا کے بعد لباس کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اس کی دیگر ضروریات کی طرح اس ضرورت کو بھی مستقل طور پر حل ہونا چاہیے۔ اسلام نے اس کے وقتی اور عارضی حل کو بھی اہمیت دی ہے۔ کسی برہنہ تن انسان کو کپڑا فراہم کرنے کا ثواب کئی ایک حدیثوں میں بیان ہوا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے:

مامن مسلم کسی مسلماً	جو مسلمان کسی مسلمان کو کپڑا پہنائے،
ثوبا الا کان فی حفظ من	وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آجاتا ہے
اللہ مادام علیہ منہ خرقۃ[2]	جب تک کہ اس پر اس کا ایک ٹکڑا بھی ہے۔

اگر آدمی کسی شخص کو اپنا بدن ڈھکنے کے لیے نیا کپڑا نہ دے سکے تو استعمال شدہ کپڑا ہی اسے پہنا دے۔ یہ بھی اجر کا باعث ہے۔ حضرت عمر رضؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے کہ جو شخص نیا کپڑا زیب تن کرے

---

[1] ابن ماجہ، ابواب الرہون، باب المسلمون شرکاء فی ثلاث۔ اس کے ایک راوی علی بن زید بن جدعان کو بالعموم محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن امام ترمذی نے اسے صدوق (سچا) کہا ہے۔ اس کی بعض روایات کو حسن اور ایک روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

[2] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الزکوٰۃ، باب فی فضل الصدقۃ بحوالہ احمد، ترمذی

اور یہ دعا پڑھے :

الحمد للہ الذی کسانی ما اواری بہ عورتی واتجمل بہ فی حیاتی۔	شکر و سپاس ہے خدا کا جس نے مجھے لباس پہنایا، جس سے میں ستر پوشی اور اپنی زندگی میں زیب و زینت کرتا ہوں۔

اس طرح اللہ کا شکر ادا کرنے کے بعد جب یہ کپڑا پرانا ہو جائے تو صدقہ کر دے، اس سے وہ اپنی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے گا۔[1]

سائل کا حق پہچاننا

وقتی اور ہنگامی مدد کا محتاج وہی شخص نہیں ہوتا جو مفلس اور نادار ہو بلکہ اس کی ضرورت خوش حال انسان کو بھی پیش آسکتی ہے۔ اس کا تعلق مالی حیثیت سے زیادہ ان حالات سے ہے جن میں وہ ہنگامی طور پر گھر گیا ہے۔ راستہ میں کسی کی جیب کٹ جائے اور اس کا اپنے گھر پہنچنا مشکل ہو جائے تو آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ آپ اس کی مدد کریں۔ دولت مند سے دولت مند انسان بھی کسی وقت مجبور و بے بس ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا حق ہے کہ اس کی حاجت پوری کی جائے۔ یہی حقیقت ایک حدیث میں اس طرح بیان کی گئی ہے، جس کی روایت امام حسینؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہے۔

للسائل حق وان جاء علی فرس[2]	سوال کرنے والا گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تو بھی اس کا (تم پر) حق ہے۔

امام خطابی فرماتے ہیں۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سائل کے ساتھ حسنِ ظن رکھا

---

[1] ترمذی، دعوات، احادیث شتی من ابواب الدعوات۔ ابن ماجہ، کتاب اللباس، باب مایقول الرجل اذا لبس ثوباً جدیداً۔

[2] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ۔ باب حق السائل۔

جائے اور فوراً اس کی تکذیب نہ کر دی جائے اس لیے کہ بظاہر چاہے وہ کتنی ہی بہتر حالت میں کیوں نہ ہو اور سواری کے لیے اپنے پاس گھوڑا ہی کیوں نہ رکھتا ہو، اس کا امکان بہر حال ہے کہ وہ کسی ناگہانی مصیبت یا قرض میں گرفتار ہو۔ ظاہر ہے ان صورتوں میں صدقہ لینا اس کے لیے جائز ہو جاتا ہے۔ کچھ اور اسباب بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ مختلف اسباب ایسے ہو سکتے ہیں جن میں سائل کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اسے لوٹا دینا صحیح نہیں ہے۔[1]

حدیث میں ایک طرف تو سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے اور پیشہ ور سائلوں کی مذمت کی گئی ہے، دوسری طرف یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ضرورت کے تحت دست سوال دراز کرے تو اس کی ضرورت جس حد تک امکان میں ہو پوری کر دی جائے۔

ام بجیدؓ نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ حضور! کبھی کوئی محتاج میرے دروازہ پر پہنچ جاتا ہے اور میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو بڑی شرم محسوس ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ۔ کچھ نہ ہو تو جلا ہوا کھر ہی اسے دے دو۔[2]

سائل کے ساتھ جو برتاؤ ہونا چاہیے اس کی ایک اعلیٰ مثال ذیل کے واقعہ میں ملتی ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ آج کسی نے کسی مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں اس کے بعد میں مسجد گیا تو دیکھا کہ ایک شخص سوال کر رہا ہے، میرا لڑکا عبدالرحمٰنؓ وہیں روٹی کا ایک ٹکڑا کھا رہا تھا میں نے وہ ٹکڑا اس کے ہاتھ سے لے کر سائل کو دے دیا۔[3]

---

[1] خطابی: معالم السنن ۲/۷۔

[2] ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب ما جاء فی حق السائل۔ ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب حق السائل۔

[3] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب المسألۃ فی المسجد۔

مریض کی عیادت اور خدمت کرنا

ہنگامی مدد کی اس شخص کو بھی ضرورت پیش آتی ہے جس پر اچانک کسی مرض کا شدید حملہ ہو جائے یا کسی حادثہ سے دوچار ہو جائے۔ اس میں تاخیر سے اس کی تکلیف بڑھ سکتی ہے اور بعض اوقات اس کی زندگی ہی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔
صحیح احادیث میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کی جائے اور دوسرا یہ کہ مرنے پر اس کے جنازہ اور تدفین میں شرکت کی جائے۔[1]

مریض کی عیادت یا خدمت بعض اوقات ایک قانونی حق کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جو شخص بر وقت اس حق کو ادا کرے وہ شریعت کے نزدیک بڑے اجر و ثواب کا مستحق ہے۔[2]

---

[1] بخاری، کتاب الجنائز، باب الامر باتباع الجنائز۔ مسلم کتاب السلام، باب من حق المسلم علی المسلم رد السلام۔

[2] عیادت سے متعلق مزید احادیث اور ان کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات، باب عیادت کی شرعی اہمیت

مشکلات کے پائیدار حل کی ضرورت

کتنی اچھی بات ہے اور کس قدر ثواب کا کام ہے اگر کوئی شخص دستِ سوال دراز کرے تو دو چار پیسوں سے اس کی مدد کر دی جائے، کسی فاقہ زدہ کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیا جائے اور جو برہنہ تن ہے اُسے تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا فراہم کر دیا جائے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ جن کو اللہ نے توفیق دی ہے اس پر عمل کرتے ہیں اور ثواب کماتے ہیں، لیکن کیا خدمتِ خلق بس یہی ہے۔ کیا اس سے اس کا پورا حق ادا ہو جاتا ہے؟ آیئے اسی سوال پر ذرا تفصیل سے غور کیا جائے۔

یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ کسی ضرورت مند کی وقتی طور پر کوئی چھوٹی بڑی مدد کر دی جائے، لیکن ضرورت وقتی نہیں ہے تو فطری طور پر اس کی مدد بھی اس وقت تک جاری رہنی چاہیئے جب تک کہ ضرورت باقی ہے۔ جس شخص کی مشکلات زیادہ بڑے تعاون کا مطالبہ کرتی ہوں یا جہاں طویل مدت تک تعاون کی ضرورت ہو وہاں ضروری ہے کہ اسی نوعیت کا تعاون بھی کیا جائے۔ جو شخص نوع بنوع پیچیدہ مشکلات میں مبتلا ہو اس کے مسائل اسی وقت حل ہوں گے جب کہ اسے ان مشکلات سے نکلنے کے لیے ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں اس کے مسائل کا عارضی نہیں مستقل حل ڈھونڈا جائے اور جن اسباب کی وجہ سے زندگی کی جدوجہد میں وہ پیچھے رہ گیا ہے ان کو دور کیا جائے، اس کی غربت کا علاج کیا جائے، اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ بھوکا ننگا نہ رہے اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ہر وقت اسے کسی کا دست نگر اور محتاج نہ ہونا پڑے۔

اگر یہ حقیقت پیش نظر ہو تو خدمت خلق کے بارے میں ہمارا تصور بدل سکتا ہے اور ہم اس کے وسیع تقاضوں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ اسے ہم بعض مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

مسکینوں اور بیواؤں کی خدمت کا وسیع تصور

کسی فقیر اور مسکین کو ایک وقت کا کھانا کھلانا بھی کارِ ثواب ہے۔ اس کی فضیلت قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے اور اس کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن ایک مسکین جب تک مسکین ہے، اس کا حق باقی رہے گا اور فرد کی بھی اور ریاست کی بھی ذمہ داری ہوگی کہ اسے اس حالت سے نکالے اور اس کے فقر و احتیاج کو مستقل طور پر ختم کرنے کی کوشش کرے تاکہ وہ معاشرہ میں باوقار اور اطمینان کی زندگی گزار سکے۔ اس کی فضیلت حدیث میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الساعی علی الارملة	بیواؤں اور مسکینوں کے لیے سعی و
والمسکین کالمجاھد	جہد کرنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے
فی سبیل اللہ او القائم	والے یا رات میں قیام کرنے والے، دن
اللیل الصائم النہار[1]	میں روزہ رکھنے والے کے مانند ہے۔

بیواؤں اور مسکینوں کے لیے دوڑ دھوپ میں وہ ساری کوششیں شامل ہیں جو ان کی فلاح و بہبود کے لیے کی جائیں۔ ان میں ان کی ضروریات کی تکمیل، ان کے لیے روزگار فراہم کرنا اور ان کو سماج میں باوقار زندگی گزارنے کے قابل بنانا سب کچھ آجاتا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں۔

المراد بالساعی الکاسب	سعی و جہد کرنے والے سے مراد وہ شخص

---

[1] بخاری: کتاب النفقات باب فضل النفقة علی الاھل، مسلم: کتاب الزہد۔

لمھما العامل	ہے جو ان کی معاش کے لیے دوڑ دھوپ
لمؤنتھا ۱؎	کرے اور ان کی ضروریات زندگی پوری
	کرنے کے لیے محنت مشقت کرے۔

اس کی شرح حافظ ابن حجر نے ان الفاظ میں کی ہے:

الذی یذھب ویجیئ	بیواؤں اور مسکینوں کو جو چیز بھی
فی تحصیل ما ینفع الارملۃ	فائدہ پہنچائے اسے حاصل کرنے کے لیے
والمسکین۔ ۲؎	دوڑ بھاگ کرنے والا۔

مسکین اور محتاج دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے اپنی ضروریات بے تکلفی کے ساتھ بیان کر کے مدد کی درخواست کرتے پھرتے ہیں۔ لیکن ایسے حاجت مند بھی ہوتے ہیں جن کی غیرت و خودداری انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ دوسروں کے سامنے اپنی حاجت کا ذکر کریں اور مدد کے لیے ہاتھ پھیلائیں۔ اس طرح کے حاجت مند افراد معاشرہ کی توجہ کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں اور ان کی ضرورت کو پورا کرنے کی زیادہ فکر ہونی چاہیئے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لیس المسکین بھذا	مسکین وہ نہیں ہے جو دستِ سوال
الطواف الذی یطوف	پھیلائے لوگوں کا طواف کرتا پھرے اور
علی الناس فتردہ اللقمۃ	جسے ایک لقمہ یا دو لقمے یا ایک آدھ کھجور لوٹا دیں
واللقمتان والتمرۃ و	کھجور دے دو۔ لوگوں نے سوال کیا پھر مسکین
التمرتان قالوا فمن	کون ہے؟ آپ نے فرمایا۔ مسکین وہ ہے
المسکین یا رسول اللہ	کہ جس کے پاس نہ تو اتنا مال ہے جو اسے دوسروں

۱؎ شرح مسلم: ۲/۴۱۱

۲؎ فتح الباری: ۹/۴۰۲

قال: الذی لایجد غنی یغنیہ	سے بے نیاز کر دے اور نہ اس کی حالت ہی
ولا یفتن لہ فیتصدق علیہ	کا علم ہوتا ہے کہ اسے صدقہ خیرات دی جائے
ولا یسئل الناس شیئاً لہ	وہ لوگوں سے کچھ نہیں مانگتا۔

یتیم کی کفالت کا صحیح مفہوم

ایک اور مثال لیجیے، یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی قرآن وحدیث میں بار بار تاکید کی گئی ہے۔ یہ حسن سلوک وقتی طور پر بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کے وسیع تقاضے اسی وقت پورے ہوں گے جب کہ ایک مدت تک اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور اسے اس قابل بنایا جائے کہ اسے معاشی استقلال حاصل ہو اور وہ دینی اور اخلاقی لحاظ سے معاشرہ کا بہترین فرد بن سکے۔ ان تقاضوں کی طرف حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اشارہ کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

کافل الیتیم	یتیم کی کفالت کرنے والا چاہے وہ
لہ او لغیرہ انا و	اس کا (رشتہ دار) ہو یا کسی دوسرے کا میں
ھو کھاتین فی الجنۃ	اور وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح
واشار مالک	(قریب) ہوں گے۔ امام مالک نے انگشت
بالسبابۃ والوسطی ؎۲	شہادت اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کر کے بتایا۔

اس حدیث میں کفالت کا لفظ بڑا اہم ہے۔ اس میں اس کی پرورش بھی داخل ہے اور تعلیم اور تربیت اور معاشی انتظام بھی۔ امام نووی نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

؎۱ مسلم: کتاب الزکوٰۃ، باب ان الید العلیا خیر من السفلی الخ

؎۲ مسلم: کتاب الزھد، باب فضل الاحسان الی الارملۃ والیتیم والمسکین۔

كافل اليتيم	یتیم کی کفالت کرنے والا یعنی اس کے
القائم بامورہ من	نان ونفقہ، لباس اور تعلیم و تربیت کا بوجھ
نفقة وكسوة وتاديب	اٹھانے والا۔ یہ فضیلت اس شخص کو بھی
وتربية وغير ذلك	حاصل ہوگی جو اپنے مال سے اس کی کفالت
وهذا الفضيلة تحصل	کرے اور وہ شخص بھی اس کا حق دار ہوگا
لمن كفله من	جو یتیم ہی کے مال سے شریعت نے سرپرستی
مال نفسه او من مال	کا جو حق دیا ہے اس کے مطابق کفالت
اليتيم بولاية شرعية[1]	کرے۔

جو شخص ان تقاضوں کی جس حد تک تکمیل کرے گا اس حد تک وہ اجر و ثواب اور فضیلت کا مستحق ہوگا اور جو اس کا صحیح معنٰی میں حق ادا کرے گا اسے جنت میں اللہ کے رسولؐ کی رفاقت بھی حاصل ہوگی۔

روزگار سے لگانے کی ترغیب

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدقہ کا مال تقسیم فرما رہے تھے۔ دو آدمی حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ انھیں بھی اس میں سے کچھ عنایت کیا جائے۔ آپؐ نے دیکھا کہ وہ تندرست و توانا ہیں تو ناگواری کے ساتھ فرمایا:

ان شئتما اعطيتكما	اگر تم چاہو تو میں صدقہ کا مال تمھیں دے
ولاحظ فيها	دوں لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ اس میں کسی مالدار
لغني ولا لقوي	کا اور کسی تندرست و توانا آدمی کا جو اپنی معاش
مكتسب[2]	حاصل کر رہا ہو کوئی حصہ نہیں ہے۔

---

[1] شرح مسلم: ۴۱۱/۲

[2] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب من یعطی من الصدقۃ وحد الغنی۔

اس حدیث میں "و لالقوی مکتسب" کا جملہ بڑا اہم ہے۔ یعنی زکوٰۃ میں کسی ایسے شخص کا حصہ نہیں ہے جو طاقت رکھتا ہو اور بکار رہا ہو۔ امام خطابی نے اس سے حسب ذیل استدلال کیا ہے۔

فیہ انہ لم یعتبر فی منع	حدیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ کسی کو زکوٰۃ
الزکوٰۃ ظاھر القوۃ والجلد	سے اس کا ذریعہ معاش دیکھے بغیر محض
دون ان ضم الیہ الکسب	اس لیے منع نہیں کیا جائے گا کہ وہ طاقت ور
فقد یکون من الناس من	اور مضبوط ہے۔ اس لیے کہ بعض لوگ
یرجع الی قوۃ البدن و	مضبوط بدن کے باوجود بے ہنر ہوتے ہیں
یکون مع ذالك اخرق الیدلا	اپنے لیے کچھ کر نہیں پاتے۔ حدیث سے
یعتمل فمن کان ھذا سبیلہ	معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کی یہ حالت ہو
لم یمنع من صدقۃ بدلالۃ	صدقہ میں اس کا حق ہے۔ اسے اس سے
الحدیث [1]	منع نہیں کیا جائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص صحت مند اور تندرست تو ہے لیکن روزگار سے نہیں ہے یا اس کے پاس روزگار تو ہے لیکن اس کے لیے ناکافی ہے تو صدقہ اور خیرات سے اس کی مدد کی جا سکتی ہے اور اس کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔ آج کتنے ہی نوجوان ہیں جو محنت و مشقت تو کر سکتے ہیں لیکن محض سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی ذریعہ معاش اختیار نہیں کر پاتے اور عسرت اور تنگ دستی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اگر ان کی یہ رکاوٹ دور کر دی جائے تو وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہیں اور انھیں معاشی استقلال حاصل ہو سکتا ہے لیکن ہمارے پاس اس کا کوئی منصوبہ نہیں ہے بلکہ شاید ذہن اس کے تصور ہی سے خالی ہے۔

---

[1] معالم السنن : ۲/۶۲

صنعت وحرفت میں تعاون کی اہمیت

حضرت ابوذرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ایک گفتگو نقل فرماتے ہیں کہ میں نے آپؐ سے دریافت کیا کہ سب سے برتر اور افضل عمل کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

ایمان باللہ وجہاد فی سبیلہ، قلت فای الرقاب افضل قال: اغلاھا ثمنا وانفسھا عند اھلھا قال فان لم افعل قال تعین ضائعا او تصنع لاخرق قال فان لم افعل قال تدع الناس من الشر فانھا صدقۃ تصدق بھا علی نفسک [1]

اللہ پر ایمان اور اس کی راہ میں جہاد۔ میں نے دریافت کیا کہ کس قسم کے غلام کو آزاد کرنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے؟ آپؐ نے فرمایا وہ غلام جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کے نزدیک زیادہ نفیس اور عمدہ ہو۔ میں نے عرض کیا اگر مجھ میں اس کی استطاعت نہ ہو اور میں اسے نہ کر سکوں؟ آپؐ نے فرمایا اس شخص کی مدد کرو جس کے بچے غربت سے ضائع ہو رہے ہوں یا جو شخص اپنا کام نہ کر سکے اس کی مدد کرو۔ میں نے عرض کیا اگر یہ بھی نہ کر سکوں؟ آپؐ نے فرمایا لوگوں کو اپنے ہی شر سے بچاؤ، یہ بھی ایک صدقہ ہے جو تم اپنے نفس پر کرو گے۔

اس حدیث میں پہلے ایمان باللہ، جہاد فی سبیل اللہ اور غلاموں کو آزاد کرنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا 'تعین ضائعا او تصنع لاخرق'۔ اسی کی یہاں تھوڑی سی تشریح کی جائے گی۔ 'تعین ضائعا' کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص غربت میں مبتلا ہو اور جس کے بیوی بچوں کے گزر بسر کی صورت نہ ہو،

---

[1] بخاری، کتاب العتق، باب ای الرقاب افضل۔ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون الایمان باللہ افضل

اس کی مدد کرو۔ اسے ضائع ہونے سے بچاؤ۔ اس مدد کی مقدار یا اس کی شکل متعین نہیں کی گئی ہے۔ اسے اس شخص کے حالات اور مدد کرنے والے کی حیثیت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ احتیاج جس نوعیت کی ہے اسی نوعیت کی مدد آدمی کو اپنی حیثیت کے مطابق کرنی چاہیے۔

ایک روایت میں 'ضائعا' کی جگہ 'صانعا' کا لفظ آیا ہے[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی ایسے شخص کی مدد کرو جس کے ہاتھ میں کوئی صنعت یا پیشہ ہے۔ اس کی مدد روپیہ پیسہ، فنی تعاون، اوزار اور مشینوں کی فراہمی اور پیداوار کے لیے بازار اور مارکیٹ پیدا کر کے کی جا سکتی ہے۔ صاحب حرفت کی مدد کا ذکر خصوصیت سے اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کی مشکلات کا بالعموم احساس نہیں ہوتا اور اس کی مدد کی طرف ذہن نہیں جاتا۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا 'او تصنع لاخرق' 'اخرق' بے ہنر کو یا ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو کوئی کام اچھی طرح نہ کر سکے[2] گویا پہلے ہنر مند کی مدد کا حکم ہوا پھر بے ہنر کی مدد کی طرف توجہ دلائی گئی۔ مطلب یہ کہ جو شخص بے ہنر ہے یا اپنا کام ٹھیک سے انجام نہیں دے پا رہا ہے اس کی مدد کی جائے۔ اگر معاشرہ میں اس کا احساس عام ہو اور اس طرح کے ادارے کام کرنے لگیں جہاں صنعت و حرفت کی تعلیم دی جائے بے ہنروں کو ہنر مند بنایا جائے اور ان کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں تو یہ خدمت خلق کی بہت اچھی شکل ہو سکتی ہے اور اس سے کمزور طبقات کے معاشی مسائل بڑی حد تک حل ہو سکتے ہیں۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نووی: شرح مسلم ۱/۶۲۔ ابن حجر: فتح الباری ۵/۹۰

[2] حافظ ابن حجر نے 'اخرق' کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔ الذی لیس بصانع ولا یحسن العمل۔ فتح الباری ۵/۹۰ علامہ ابن اثیر کہتے ہیں۔ الاخرق ای جاھل بما یجب ان یعملہ ولم یکن فی یدیہ صنعۃ یکتسب بھا۔ النہایہ فی غریب الحدیث ۱/۲۹۸

خدمت کے بعض متعیّن پہلو

انسان کی وقتی اور ہنگامی خدمت اور اس کے مسائل اور مشکلات کے مستقل حل کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ قرآن و حدیث میں خدمت کے بعض متعین پہلو بھی بیان ہوئے ہیں۔ یہ وہ پہلو ہیں جو معاشرہ کو اوپر اٹھانے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور معاشی اور اقتصادی حیثیت سے ان کے دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

مالی تعاون کرنا

خدمت کی ایک صورت مالی تعاون ہے۔ اس کی اہمیت واضح ہے۔ قرآن مجید نے قرابت داروں کا حق پہچاننے، کم زوروں، مجبوروں اور محروموں کی مالی اعانت کرنے پر بڑا زور دیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق یا مغرب کی طرف کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، اس کی کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائے، اور مال کی محبت کے باوجود اسے یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں پر اور غلاموں کے لیے خرچ کرے اور نماز قائم کرے اور

عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ؁ (البقرۃ: ۱۷۷)

زکوٰۃ دے۔ نیک وہ ہیں جو عہد کرتے ہیں تو اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جو فقر و فاقہ اور تنگی میں اور جنگ کے وقت صبر کرتے ہیں۔ یہی راست باز ہیں اور یہی متقی ہیں۔

اس آیت میں پہلے اہل کتاب کی رسمی دین داری پر تنقید کی گئی ہے، اس کے بعد حقیقی دین داری کا بیان ہوا ہے۔ یہاں 'بِرّ' کا لفظ بڑا اہم ہے۔ اس کے معنی حقوق ادا کرنے کے ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی آتے ہیں اور بندوں کے حقوق بھی۔[۱] دونوں ہی کے حقوق کا پہچاننا ضروری ہے۔ آدمی بِرّ و تقویٰ کے بلند مقام کو اسی وقت پا سکتا ہے جب کہ اس کے دل میں ایمان کا نور جگمگا رہا ہو اور وہ قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں، محکوموں، غلاموں اور معاشرہ کے دیگر کم زور افراد اور طبقات پر محنت سے کمائی ہوئی اپنی دولت صرف کرے۔ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر بھی اسی حقیقت کو سمجھانے کے لیے ہے۔ نماز اللہ سے تعلق اور زکوٰۃ انسانوں کی خدمت کی بالکل متعین شکلیں ہیں۔ بعض دوسری آیتوں میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ انسان کا مال تنہا اس کا نہیں ہے بلکہ اس میں معاشرہ کے کم زوروں اور ناداروں کا حق ہے اس حق کا ادا کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ

قرابت دار کو اس کا حق اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو اور فضول خرچی

---

[۱] علامہ حمید الدین فراہیؒ فرماتے ہیں۔ البر اصلہ ایفاء الحق فتنفرع منہ ما یکون ایفاء للحقوق الاصلیۃ من الطاعۃ للرب والابوین والمواساۃ بالناس ومن ھٰذہ الجہۃ صار بمعنی الاحسان واشتمل الخیرات وصار وصفا للرب تعالیٰ (مفردات القرآن/۳۹)

تَبۡذِيۡرًا ○ اِنَّ الۡمُبَذِّرِيۡنَ كَانُوۡۤا اِخۡوَانَ الشَّيٰطِيۡنِ ؕ وَكَانَ الشَّيۡطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوۡرًا ○ (بنی اسرائیل : ۲۶۔۲۷)

نہ کرو۔ بے شک فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

یہاں یہ بتانے کے بعد کہ انسان کے مال میں دوسروں کا بھی حق ہے، اسراف اور تبذیر سے منع کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اسراف اور تبذیر میں مبتلا ہو وہ دوسروں کا حق پہچان نہیں سکتا۔

یہی آیت ایک دوسرے سیاق میں سورۂ روم میں آئی ہے۔

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ○ فَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى حَقَّهٗ وَالۡمِسۡكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ ؕ ذٰلِكَ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَ اللّٰهِ ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ○ (الروم: ۳۸۔۳۷)

کیا یہ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔ (جب یہ حقیقت ہے کہ جس کے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا دیا ہوا ہے) تو تم قرابت دار کو اس کا حق اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو۔ یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ روم دونوں ہی مکی سورتیں ہیں، مکہ میں زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی تھی، لیکن ان آیات میں قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق بیان ہوا ہے۔ امام رازی سورۂ روم کی آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں: اس میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے ساتھ حسن سلوک کرنا واجب ہے۔ زکوٰۃ کے لیے حولانِ حول شرط ہے یہاں یہ شرط نہیں ہے۔ انسان کو محتاجین کے ساتھ حسن سلوک بہرحال کرنا ہوگا اس لیے کہ یہاں (زکوٰۃ کا نہیں) مخلوق کے ساتھ عام شفقت کا ذکر ہے۔ یہ تینوں طبقات

وہ ہیں جن کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرنا ضروری ہے، چاہے احسان کرنے والے کے پاس زائد از ضرورت مال ہو یا نہ ہو[1]

ان آیتوں پر ایک اور پہلو سے غور فرمایئے۔ ان میں یہ تصور دیا گیا ہے کہ معاشرہ کے کمزور افراد پر انسان مال خرچ کرکے ان پر کوئی احسان نہیں کرتا بلکہ یہ ان کا حق ہے جسے وہ ادا کرتا ہے۔ یہی تصور سرمایہ دار کو کمزوروں کے استحصال سے روکتا ہے اگر دولت مند کو یہ احساس ہو کہ اس کے پاس جو دولت ہے اس میں دوسروں کا حق ہے اور اس حق کا ادا کرنا اس کے لیے ضروری ہے تو وہ کشمکش پیدا نہیں ہو سکتی جو غریب اور امیر کے درمیان آج پائی جاتی ہے۔

قرض کے ذریعہ مدد کرنا

بعض اوقات آدمی کو اپنی معاشی حالت ٹھیک کرنے یا کسی ناگہانی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مالی مدد کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مدد نہ پہنچے تو اس کے حالات زیادہ خراب ہو سکتے ہیں اور اس کی مشکلات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کی مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اسے قرض دیا جائے تاکہ وہ بروقت اپنی ضرورت بھی پوری کرلے اور پھر قرض دینے والے کو اس کی رقم بھی واپس کر دے۔ یہ بھی دراصل کسی ضرورت مند کے ساتھ تعاون کی ایک صورت ہے۔ احادیث میں اس کی فضیلت اور ثواب بیان ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما من مسلم یقرض مسلماً قرضاً مرتین الا کان کصدقتها مرة[2]

جو مسلمان کسی مسلمان کو دو مرتبہ قرض دیتا ہے وہ گویا ایک مرتبہ صدقہ کرتا ہے۔

---

[1] رازی: تفسیر کبیر: ۵۶۴/۲

[2] ابن ماجہ: ابواب الصدقات، باب بالقرض۔ اس حدیث کی سند پر تنقید کی گئی ہے۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے۔ ملاحظہ ہو نیل الاوطار: ۳۴۷/۵

امام شوکانی فرماتے ہیں کہ قرض کی فضیلت کے سلسلے میں احادیث موجود ہیں۔ ان کی تائید قرآن وحدیث کے ان عمومی بیانات سے بھی ہوتی ہے جن میں مسلمانوں کی ضرورت پوری کرنے، ان کا تعاون کرنے، ان کی مشکلات کو رفع کرنے اور ان کے فقرو فاقہ کو دور کرنے کی صراحت ہے۔ اس میں قرض دینا بھی شامل ہے۔ مسلمانوں کے درمیان اس کے جائز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ابن رسلان کہتے ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وقت ضرورت آدمی قرض کی درخواست کرسکتا ہے، اس کی وجہ سے قرض مانگنے والے کے مقام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اگر اس میں کوئی قباحت ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرض نہ لیتے۔[1]

کاروباری زندگی میں قرض کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے کسی کاروبار کے شروع کرنے، اسے جاری رکھنے اور وقتاً فوقتاً پہنچنے والے نقصانات کو پورا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ موجودہ دور میں تو قرض کاروبار کا ایک ضروری جزو بن گیا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ قرض کا لین دین بند ہو جائے تو بڑے بڑے کاروباری ادارے ختم ہو جائیں، لیکن آج کا مادی ذہن قرض کو مادی منفعت کا بہترین ذریعہ تصور کرتا ہے۔ اس لیے بغیر سود کے کوئی کسی کو قرض دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا بلکہ شرح سود زیادہ سے زیادہ رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ قرض دار جب قرض سے خود نفع حاصل کرتا ہے تو قرض دینے والے کو بھی اس کا ایک حصہ ملنا چاہیے، یہ بات صحیح نہ ہوگی کہ جس شخص نے قرض دیا ہے اس کو نظر انداز کر کے اس کے پیسے سے تنہا قرض دار فائدہ اٹھاتا چلا جائے۔

دوسرے یہ کہ آج پوری دنیا میں سکہ کی قیمت میں کمی کا عام رجحان ہے، اس وقت بازار میں سو روپے کی جو قیمت ہے ایک سال میں وہ گھٹ کر اسی یا نوے روپے ہو جائے گی۔ اس طرح ایک سال کے بعد سو روپے کی واپسی

---

[1] نیل الاوطار : ۵/ ۳۴۷

کا مطلب اصلاً اسی یا نوے روپے کی واپسی ہوتی ہے۔ اس میں قرض دینے والے کا سراسر نقصان ہے۔ اسی قسم کے دلائل کی بنیاد پر سود کے لیے وجہ جواز فراہم کی جاتی ہے۔

اسلام اس مادی ذہن کے خلاف ہے۔ وہ قرض کو نفع حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھتا بلکہ اس کے نزدیک یہ ایک طرح کا احسان ہے جو کسی ضرورت مند کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ قرض دار سے سکہ کی قیمت کی روز افزوں کمی کا حساب کر کے سود در سود وصول کرنے کی جگہ اس کے ساتھ ممکنہ رعایت کی جائے۔ وہ ادائیگی کے لیے مزید وقت اور مہلت مانگے تو اسے مزید وقت اور مہلت دی جائے اور مالی مشکلات کی وجہ سے وہ قرض ادا نہ کر سکے تو اسے معاف بھی کر دیا جائے۔ قرآن مجید میں سود کی حرمت کے اعلان کے ساتھ قرض کے سلسلے میں اسی اعلیٰ اخلاقی رویہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ○ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود تمھارا دوسروں پر رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ اگر تم یہ نہیں کرتے ہو تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ اگر تم سود لینے سے توبہ کر لو تو تمھیں اپنا اصل مال لینے کا حق ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو گے اور نہ کوئی دوسرا تم پر ظلم کرے گا۔ قرض دار تنگ دست ہے تو اس کی کشائش تک اسے مہلت دو، اور بخش دو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔ اور ڈرتے رہو اس دن سے کہ جس

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ	دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ پھر
ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ	ہر نفس نے جو کچھ یہاں کمایا ہے اس کا پورا
هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ٥ (البقرہ: ۲۸۰-۲۸۱)	بدلہ اسے دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

احادیث میں ایک طرف تو قرض دار کو بہتر طریقے سے قرض ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور دوسری طرف قرض دینے والے کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ قرض دار کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے اونٹ قرض لیا تھا۔ وہ آپؐ سے بڑی درشتی کے ساتھ (غالباً وہ یہودی یا بدوی تھا) مطالبہ کرنے لگا۔ صحابہ کرامؓ نے اس کا سخت جواب دینا چاہا تو آپؐ نے فرمایا دَعُوْهُ فَاِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا (جانے دو، جس کا حق ہے وہ سختی سے بولنے کا بھی حق رکھتا ہے) ایک اونٹ خرید کر اسے دے دو۔ صحابہؓ نے عرض کیا اس نے جس عمر کا اونٹ دیا تھا وہ تو نہیں ہے۔ البتہ اس سے بہتر اونٹ مل رہا ہے آپؐ نے فرمایا وہی خرید کر دے دو۔ "فَاِنَّ خَيْرَكُمْ اَحْسَنُكُمْ قَضَاءً" (اس لیے کہ تم میں بہتر آدمی وہ ہے جو اچھے طریقے سے اپنا قرض ادا کرے[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض دار کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنے کی فضیلت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

من انظر معسرًا او	جس نے کسی تنگ دست کو مہلت
وضع عنہ اظلہ اللہ	دی یا قرض کو معاف کر دیا اللہ تعالیٰ
فی ظلہ[2]	اسے اپنے سایہ میں جگہ دے گا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] بخاری، کتاب فی الاستقراض، باب استقراض الابل۔ مسلم کتاب المساقات، باب جواز اقتراض الحیوان الخ

[2] مسلم، کتاب الزہد باب حدیث جابر الطویل وقصۃ ابی الیسر۔

من انظر معسراً او وضع لہ اظلہ اللہ یوم القیامۃ تحت ظل العرش یوم لا ظل الا ظلہ [1]

جس نے کسی تنگ دست کو مہلت دی یا اس کے قرض کو معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے عرش کے سایہ میں جگہ دے گا جس روز کہ اس کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی تھی وہ لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا، اس نے ملازمین کو تاکید کر رکھی تھی۔ اَنْ اَنْظِرُوا الْمُعْسِرَ وَ تَجَاوَزُوْا الْمُوْسِرَ (جو تنگ حال ہے قرض کے وصول کرنے میں اسے مہلت دیں اور جو خوش حال ہے اس سے ادائیگی میں کچھ کمی بیشی ہو تو نظر انداز کر دیں) اللہ تعالیٰ نے اس کے اس نیک عمل کی وجہ سے اسے جنت میں داخل کر دیا۔[2]

ایک مرتبہ ایک قرض دار نے قرض خواہ سے رعایت کا مطالبہ کیا۔ اس پر دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ قرض خواہ نے قسم کھا کر کہا میں کسی قسم کی رعایت نہیں کروں گا۔ آپؐ حجرے سے باہر تشریف لائے اور فرمایا نیکی نہ کرنے کی قسم کس نے کھائی تھی؟ اس نے کہا حضورؐ میں نے ہی قسم کھائی تھی (یہ میری غلطی تھی) اب وہ جو صورت پسند کرے اس پر عمل کر سکتا ہے۔[3]

ابن ابی حدرد نے حضرت کعب بن مالکؓ سے قرض لیا تھا انھوں نے اس کا مطالبہ کیا۔ وہ مجبوری کی وجہ سے ادا نہیں کر پا رہے تھے۔ جب بات بڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب کو آواز دی اور اشارے سے فرمایا نصف

---

[1] ترمذی، ابواب البیوع باب ما جاء فی انظار المعسر۔

[2] بخاری، کتاب البیوع۔ باب من انظر معسراً۔ مسلم، کتاب المساقات باب فضل انظار المعسر الخ

[3] بخاری، کتاب الصلح باب ہل یشیر الامام بالصلح۔ مسلم، کتاب المساقاۃ والمزرعۃ۔ باب استحباب الوضع فی الدین

معاف کر دو اور نصف لے لو۔ چنانچہ انھوں نے صرف آدھا قرض وصول کیا اور آدھا معاف کر دیا[1]

قرض کا پیسہ ڈوب جائے یا قرض دار اسے ادا نہ کر سکے تو اس کے احکام و مسائل الگ ہیں۔ یہاں ان سے بحث نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ کسی ضرورت مند کو قرض دینا، اس کے ساتھ تعاون ہے۔ اس کا معاوضہ ڈھونڈھنا اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ جسے قرض دیا جائے اس کے ساتھ لطف و محبت اور نرمی کا رویہ اختیار کرنا، اس کی کمزوری سے فائدہ نہ اٹھانا، اس کی مجبوریوں کی رعایت کرنا اور اسے ممکنہ سہولتیں فراہم کرنا، یہ سب حسن سلوک اور خدمت کی تعریف میں آتا ہے۔

ضرورت کی چیز ہبہ کرنا

خدمت اور حسن سلوک کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کسی کو اس کی ضرورت کی کوئی چیز ہبہ کر دی جائے۔ لسان العرب میں ہبہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے،

العطیۃ الخالیۃ عن الاعواض والاغراض[2]۔ ہبہ اس عطیے کو کہا جاتا ہے جو کسی بدلے یا غرض سے خالی ہو۔

علامہ نسفی کہتے ہیں۔

ھی تملیك العین بلاعوض[3]	کسی چیز کا مالک بنا دینا اس کا عوض لیے بغیر۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز ہبہ کی جائے اس کے بدلے میں کوئی چیز نہ لی

---

[1] بخاری کتاب الصلح، باب ہل یشیر الامام بالصلح مسلم کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب استحباب الوضع من الدین۔

[2] ابن منظور، لسان العرب مادہ و۔ہ۔ب

[3] کنز الدقائق / ۳۰۸

جائے اور اس سے کوئی غرض بھی وابستہ نہ ہو بلکہ جو چیز ہبہ کی جائے وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے کی جائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آدمی ہبہ کی ہوئی چیز کو قیمتاً بھی نہ خریدے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو جو جہاد میں جا رہا تھا ایک عمدہ گھوڑا ہبہ کیا۔ لیکن وہ شخص مالی لحاظ سے کمزور تھا، گھوڑے کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہ کر سکا، اس کی وجہ سے گھوڑا ضائع ہونے لگا، مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ اسے فروخت کر دے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا:

لا تشتره وان	اسے نہ خریدو، چاہے وہ ایک درم
اعطاکه بدرهم	ہی میں وہ تمھیں کیوں نہ دے۔ اس لیے
واحد فان العائد	کہ جو شخص اپنی صدقہ کی ہوئی چیز کو واپس
فی صدقته کالکلب	لیتا ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے
یعود فی قیئه [1]	کتا قے کر کے اسے دوبارہ چاٹنے لگے۔

یہ بہت چھوٹی حرکت ہے کہ آدمی کسی کو کوئی چیز دے کر پھر اسے واپس لے لے۔ اس سے نفس کے اندر ہمدردی اور محبت کے جو پاک جذبات ایک مرتبہ پیدا ہوئے تھے وہ مجروح ہوتے ہیں اور مال کی محبت زیادہ شدت کے ساتھ ابھر آتی ہے۔ ہبہ یا صدقہ کی ہوئی چیز کو دوبارہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے سابق اقدام پر پچھتا رہا ہے یا جسے اس نے ہبہ کیا ہے، اسے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اگر آدمی کسی کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا اقدام نہ کرے تو شاید اس کی عزت نفس کو اتنا نقصان نہیں پہنچ سکتا جتنا کہ اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لینے سے اسے پہنچ سکتا ہے۔ ہبہ کی ہوئی چیز کو خریدنے سے بھی اس لیے منع کیا گیا ہے کہ اس میں یہ امکان ہے کہ ہبہ کرنے والا اپنے سابقہ احسان سے فائدہ اٹھائے اور جسے ہبہ کیا گیا ہے وہ بھی اس کے ساتھ بادل ناخواستہ ہی سہی رعایت کرنے پر مجبور ہو جائے۔[2]

---

[1] بخاری، کتاب الہبہ، باب لا یحل لاحد ان یرجع فی ہبتہ وصدقتہ۔ مسلم، کتاب الہبات، باب کراہۃ شراء الانسان ما تصدق بہ۔

[2] فقہ حنفی کی رو سے ہبہ سے رجوع کرنے میں بعض موانع نہ ہوں تو ہبہ کرنے والے کو رجوع کا اختیار ہے لیکن (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کوئی چیز عاریتاً دینا

خدمت اور تعاون کی ایک شکل یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کو عاریتاً کوئی چیز دی جائے تاکہ وہ ایک متعین مدت تک فائدہ اٹھانے کے بعد اسے واپس لوٹا دے۔ حدیث میں اسے بھی بہترین صدقہ اور عطیہ کہا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نعم الصدقة اللقحة الصفی منحة الشاة الصفی منحة تغدو باناء وتروح بآخر[1]	بہترین صدقہ یہ ہے کہ کسی کو بطور عطیہ (چند دن کے لیے) بہت ہی عمدہ گابھن اونٹنی دی جائے جو (جلد ہی خوب دودھ دینے والی ہو) یا عمدہ بکری دی جائے جو صبح ایک برتن بھر کر اور شام ایک برتن بھر کر دودھ دے۔

یہ بخاری کی روایت ہے، مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

الا رجل یمنح اھل بیتٍ ناقةً تغدو بعُسٍ وتروح بعُسٍ ان اجرھا لعظیم[2]	جو شخص کسی گھر والے کو اونٹنی دے جو اُسے صبح ایک بڑا برتن بھر کر اور شام ایک بڑا برتن بھر کر دودھ دے تو اس کا اجر بے شک بڑا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اسے کردہ تنزیہی بلکہ کردہ تحریمی کہا گیا ہے (درالمختار مع ردالمحتار ۴/۹۰، اور اس سے آگے) امام شافعیؒ امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ کے نزدیک اس حدیث کا تعلق کسی اجنبی کو ہبہ کرنے سے ہے۔ اگر اولاد یا ان کی اولاد۔ یہ سلسلہ جہاں تک بھی چلا جائے۔ کو ہبہ کیا گیا ہے تو اس سے رجوع بھی ہو سکتا ہے (نووی شرح مسلم ۲/۳۶) تفصیلات فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

[1] بخاری، کتاب الاشربة، باب شرب اللبن۔

[2] مسلم کتاب الزکوٰة، باب فضل المنیحة۔

حضرت براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من منح منيحة لبن	جو شخص چند دن کے لیے کسی کو دودھ
او ورق او هدى زقاقاً	دینے والا جانور یا چاندی (روپیہ پیسہ قرض) دے یا
كان له مثل عتق	کسی کو راستہ دکھادے تو اس کا اتنا ثواب
رقبة [1]	ہوگا جتنا ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ہوتا ہے۔

چاندی دینے سے یہاں مراد جیسا کہ امام ترمذی نے لکھا ہے قرض ہے [2]

"هدى زقاقا" کا ایک ترجمہ تو یہی ہے کہ اس نے راستہ دکھایا۔ یہی الفاظ سے قریب تر ہے [3] لیکن بعض لوگوں نے اسے 'هدّى زقاقا' بھی روایت کیا ہے۔ زقاق، تنگ گلی اور درختوں کی رو کو کہتے ہیں [4] اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث میں اس شخص کا ثواب بیان ہوا ہے جس نے اپنے باغ میں سے درختوں کی ایک رو کسی کو تحفہ کے طور پر دے دی۔

ان حدیثوں کے دو تین پہلو اہم اور قابلِ غور ہیں:۔

ایک یہ کہ بطور قرض جو رقم دی جاتی ہے یا عارضی طور پر فائدہ اٹھانے کے لیے جو جانور دیا جاتا ہے اسے ان حدیثوں میں صدقہ اور منیحہ (عطیہ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے گو کہ یہ چیزیں ایک خاص مدت کے بعد واپس ہو جاتی ہیں لیکن ان کے ذریعہ مشکل وقت میں انسان کی مدد ہوتی ہے، اس لحاظ سے یہ بھی ایک طرح کا صدقہ اور احسان ہے۔ عارضی مدد بھی بعض اوقات بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی اہمیت کو یہاں واضح کیا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ حدیث میں گو کہ کسی غریب کو جانور کے دودھ سے فائدہ اٹھانے کی

---

[1] ترمذی، ابواب البر والصلہ، باب ما جاء فی المنحہ

[2] معنی قولہ من منح منیحۃ ورق انما یعنی بہ قرض الدراہم (ترمذی حوالہ سابق)

[3] ابن منظور: لسان العرب، مادہ ز، ق، ق

[4] ابن اثیر: النہایہ فی غریب الحدیث ۲/۲۴۴

اجازت دینے کا ثواب بیان ہوا ہے لیکن یہی حکم اس بات کا بھی ہے کہ کسی کو جانور کے بال، اون، کھاد اور اس کے بچے سے فائدہ حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔[1]

تیسرے یہ کہ عرب کی معاشی زندگی میں دودھ والے جانور کی بڑی اہمیت تھی اس لیے اس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ آج اس کی جگہ زراعتی ساز و سامان اور صنعتی اوزار اور مشینوں نے لے لی ہے۔ ان کا عاریتاً فراہم کرنا بھی اسی حکم میں آئے گا۔

ایک ہی نوعیت کی دو چیزیں دینا

حدیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں جو چیز بھی دے وہ ایک سے دو دے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من انفق زوجین فی سبیل اللہ نودی من ابواب الجنۃ یا عبد اللہ ھذا خیر[2]	جو شخص اللہ کی راہ میں کوئی بھی دو چیزیں دے اسے جنت کے دروازوں سے آواز دی جائے گی کہ اے اللہ کے بندے یہ ہے کارِ خیر (یعنی تم نے نیکی کا بڑا کام انجام دیا ہے)

حضرت ابوذرؓ کی ایک روایت میں ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ما من عبدٍ مسلم ینفق من کل مالٍ لہ زوجین فی سبیل اللہ	جو بندۂ مسلم بھی اپنے ہر مال میں سے ایک جوڑا اللہ کے راستہ میں خرچ کرے گا قیامت کے روز جنت کے دربان اس کا ہر طرف سے

---

[1] فیروز آبادی: قاموس: مادہ م، ن، ح۔ ابن اثیر: النہایہ فی غریب الحدیث: ۴/۱۱۰

[2] بخاری کتاب الصوم۔ باب الریان للصائمین۔ مسلم کتاب الزکوٰۃ۔ باب من ضم الی الصدقۃ الخ

الا استقبلته حجبة	استقبال کریں گے ان میں سے ہر ایک اسے
الجنة کلهم یدعوه	ان نعمتوں کی دعوت دے گا جو اس کے پاس
الی ما عنده، قلت وکیف	ہوں گی۔ میں نے دریافت کیا کہ ایک جوڑا
ذالك قال ان کانت ابلاً	خرچ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا (جیسے)
فبعیرین وان کانت	اگر اونٹ ہوں تو ۲ دو اونٹ گائیں ہوں تو دو
بقرة فبقرتین [1]	گائیں۔

ان احادیث میں ایک پہلو یہ ہے کہ ان میں انفاق کی فضیلت بیان ہوئی ہے اور صاحبِ مال کو اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرے۔

ان کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان میں سوسائٹی کے کمزور طبقات کی ضرورتوں کو سامنے رکھا گیا ہے اور صاحبِ حیثیت افراد کو انھیں پورا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ آدمی کی ضروریات کبھی اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ اسے ایک ہی نوعیت کی دو چیزیں دی جائیں۔ جیسے ہل جوتنے، سینچائی کرنے یا سامان ڈھونے والی گاڑی کے لیے دو بیلوں یا دو بھینسوں کی ضرورت پیش آتی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی کے اخراجات ہی اتنے زیادہ ہوں کہ اس کے لیے دودھ والی ایک گائے یا بھینس نہ کافی ہو، ظاہر ہے جس کی جتنی بڑی ضرورت پوری کی جائے گی اس کا اتنا ہی بڑا اجر و ثواب ہوگا۔ حدیث میں راہ خدا میں ایک سے دو گائیں دینے کا ثواب بیان ہوا ہے، اسے ایک مثال سمجھنا چاہیے۔ 'زوجین' کے لفظ کے اندر وسعت ہے۔ اس کا مطلب ہے ایک جنس کی دو چیزیں۔ اس میں روپیہ، پیسہ، کپڑا اور دیگر ساز و سامان بھی شامل ہے۔ اس میں زراعت کے آلات اور مشینیں وغیرہ بھی آسکتی ہیں۔

بعض لوگوں نے فی سبیل اللہ سے جہاد مراد لیا ہے لیکن جیسا کہ قاضی عیاض نے

---

[1] نسائی، کتاب الجہاد، باب فضل النفقۃ فی سبیل اللہ عزوجل

لکھا ہے، زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان الفاظ میں نیکی اور حسن سلوک کے سارے کام آجاتے ہیں۔[1]

کاروبار میں شریک کرنا

کاروبار کے لیے سرمایہ اور محنت دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی آدمی کے پاس سرمایہ تو ہوتا ہے لیکن جس قسم کی محنت کرنی چاہیئے وہ نہیں کر پاتا، کبھی محنت کے قابل تو ہوتا ہے لیکن مطلوبہ سرمایہ مفقود ہوتا ہے۔ محنت اور سرمایہ کو جمع کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ سرمایہ دار سرمایہ فراہم کرے اور محنت کرنے والا محنت کرے اور نفع میں دونوں شریک ہوں۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں مضاربت کہا جاتا ہے۔ مضاربت کی تعریف علامہ ابن اثیر نے ان الفاظ میں کی ہے۔

المضاربۃ ان تعطی	مضاربت یہ ہے کہ تم کسی کو مال دو
مالاً لغیرك یتجر فیہ فیکون	تاکہ وہ اس سے تجارت کرے اور اس میں
لہ سھمٌ معلوم [2]	اس کا ایک متعین حصہ ہو۔

ہدایہ میں ہے کہ ایک جانب سے مال اور دوسری جانب سے عمل کی بنیاد پر نفع میں شرکت کو مضاربت کہا جاتا ہے۔ اس کی ضرورت اور شرعی حیثیت پر اس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے کہ مضاربت ہمیشہ سے جاری رہی ہے اس لیے کہ لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کے پاس مال تو ہوتا ہے لیکن صحیح طریقہ سے وہ اس کا استعمال نہیں کر سکتے۔ بعض لوگ اس کا صحیح استعمال تو جانتے ہیں لیکن خالی ہاتھ ہوتے ہیں۔ اس لیے مضاربت کی ضرورت پیش آتی ہے تاکہ ناسمجھ اور سمجھ دار، محتاج اور دولت مند دونوں طرح کے لوگوں کی ضروریات پوری ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اس پر عمل ہو رہا تھا۔ آپؐ نے

---

[1] نووی: شرح مسلم: ۱/۳۳۰ فی سبیل اللہ کے بعض پہلوؤں کی طرف حافظ ابن حجر نے بھی اشارہ کیا ہے۔ فتح الباری: ۱۹/۶

[2] النہایۃ فی غریب الحدیث: ۳/۱۴

اسے باقی رکھا اور صحابہؓ نے اس پر عمل کیا۔[1]

صحابہؓ کے اس پر عمل کا ثبوت حضرت عبداللہ بن ہشام کی روایت سے ملتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بچپن میں ان کی والدہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئیں آپؐ نے ان کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور برکت کی دعا فرمائی۔ اس کے اثر سے کاروبار میں انھیں بڑا فائدہ ہوتا تھا۔ ان کے پوتے زہرہ بن معبد کہتے ہیں کہ میں اپنے دادا کے ساتھ بازار جایا کرتا تھا، وہ غلہ خریدتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ان سے ملاقات کرتے اور کہتے کہ اس سودے میں ہمیں بھی شریک کر لو بعض اوقات وہ ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر سامان نفع میں حاصل کر کے گھر بھیجتے تھے۔[2]

علامہ ابوالقاسم خرقی فرماتے ہیں کہ کاروبار میں شرکت کا جواز کتاب، سنت اور اجماع تینوں سے ثابت ہے، علامہ ابن قدامہ حنبلی نے لکھا ہے کہ شرکت کے جواز پر مسلمانوں کا فی الجملہ اجماع ہے، اختلاف ہے تو اس کی بعض شکلوں کے بارے میں ہے۔[3]

شرکت سرمائے میں بھی ہو سکتی ہے اور محنت میں بھی۔ دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ آج کے دور میں کاروبار اتنا پیچیدہ ہو گیا ہے کہ آدمی چھوٹے موٹے سرمایہ سے کوئی بڑا کاروبار نہیں کر سکتا، جو لوگ بڑا کاروبار کرنا چاہتے ہیں وہ اپنا سرمایہ یکجا کر کے کمپنیاں قائم کرتے ہیں، ان ہی کمپنیوں کے ذریعہ بڑے کاروبار ہوتے ہیں سرمایہ لگانے والے ان میں شریک اور حصہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ خدمت خلق کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ایسی کمپنیاں قائم ہوں جس میں کم پیسے والے بھی شریک ہو کر ترقی کر سکیں۔

---

[1] ہدایہ : ۳/۲۵۵

[2] بخاری کتاب الشرکۃ، باب الشرکۃ فی الطعام وغیرہ۔

[3] المغنی : ۵/۳

موجودہ دور میں فنی مہارت اور صنعتی تجربہ نے غیر معمولی اہمیت اختیار کرلی ہے اس کے بغیر کوئی کارخانہ یا فیکٹری نہیں چلائی جاسکتی۔ بڑے بڑے صنعتی اداروں میں تو مختلف قسم کے فنی ماہرین کی ضرورت پیش آتی ہے، بعض اوقات محض سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اس طرح کے ماہرین صنعتی میدان میں آگے نہیں بڑھ پاتے، ان کے ساتھ تعاون کی ایک بہترین شکل یہ ہے کہ سرمایہ دار اپنی صنعت میں انھیں حصہ دار بنائیں اور شرکت کی بنیاد پر ان کا تعاون حاصل کریں، لیکن آج کا سرمایہ دارانہ ذہن کسی کو ملازم تو رکھ سکتا ہے لیکن کاروبار میں شریک نہیں کرسکتا۔

زراعت میں شریک کرنا

زراعت اور کھیتی باڑی میں بھی شرکت ہوسکتی ہے۔ موجودہ دور میں بڑے بڑے فارموں کے وجود میں آنے، زراعت کے طریقوں کے بدل جانے اور مشینوں اور آلات کے عمل دخل کی وجہ سے اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ احادیث میں بٹائی پر زراعت کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ ایک شخص کی زمین پر دوسرا شخص زراعت کرے، باغ ہو تو اس کی دیکھ بھال اور ضروریات کا انتظام کرے اور جو آمدنی ہو وہ طے شدہ شرائط کے مطابق دونوں کے درمیان تقسیم ہوجائے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ہجرت کے بعد انصارؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمارے کھجور کے باغات کو آپ ہمارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم فرما دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا یہ نہیں ہوگا، اس پر انصار نے کہا کہ مہاجرین ان باغات کی دیکھ بھال اور آب پاشی کا نظم کریں اور جو فصل آئے وہ ہمارے اور ان کے درمیان تقسیم ہوجائے، اسے مہاجرین نے تسلیم کرلیا۔[1]

حضرت ابوجعفر باقرؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں مہاجرین کے جتنے خاندان تھے سب

---

[1] بخاری، کتاب المزارعۃ، باب اذا قال اکفنی مؤنۃ النخل وغیرہ۔

ہی ایک تہائی، چوتھائی (جیسے طے ہو) پر زراعت کرتے تھے۔ (صحابہ میں) حضرت علیؓ، حضرت سعدؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (تابعین میں) عمر بن عبدالعزیز، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر اور حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے گھرانوں کے افراد اور ابن سیرین نے اس پر عمل کیا ہے۔

عبدالرحمن بن اسود کہتے ہیں کہ میں عبدالرحمن بن یزید کے ساتھ زراعت میں شریک رہا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ باغات اور زمینوں کو بٹائی پر اس شرط کے ساتھ دیتے تھے کہ اگر بیج وغیرہ ان کے ذمہ ہو تو پیداوار کا نصف ان کا ہوگا لیکن اگر کاشت کار کھیتی کا سامان ہل وغیرہ اور بیج فراہم کریں تو وہ دو تہائی کے اور حضرت عمرؓ ایک تہائی کے حق دار ہوں گے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ زمین دار اور کسان دونوں مل کر خرچ کریں اور جو آمدنی ہو وہ طے شدہ شرائط کے مطابق تقسیم ہو جائے۔ امام زہری کی بھی یہی رائے ہے۔

حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ اس شرط پر کپاس چنی جا سکتی ہے کہ محنت کرنے والا (مثال کے طور پر) نصف کا مالک ہوگا۔ ابن سیرینؒ، عطاءؒ، حکمؒ، زہری اور قتادہؒ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ بنکر کو سوت اس شرط پر فراہم کیا جائے کہ تیار شدہ کپڑے کا ایک تہائی یا چوتھائی اسے ملے گا۔

معمرؒ کہتے ہیں کہ ایک متعین مدت کے لیے جانور اس شرط پر دیے جا سکتے ہیں کہ جو آمدنی ہوگی اس کا تہائی یا چوتھائی مالک کو ملے گا۔[1]

ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے ایسا ماحول پیدا کیا تھا کہ اس میں وسائل و ذرائع اور قوت و صلاحیت سے یکساں فائدہ اٹھایا جاتا تھا، ہمارے معاشرے

---

[1] بخاری، کتاب المزارعۃ، باب المزارعۃ بالشطر ونحوہ۔ تفصیل کے لیے دیکھی جائے۔ فتح الباری ۵/۷-۹، زمین کے معاملے میں مشارکت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہے لیکن صاحبین (امام یوسف اور امام محمد) نے اسے جائز قرار دیا ہے، فقہ حنفی کا فتویٰ صاحبین ہی کے قول پر ہے۔ ہدایہ ۳/۴۲۲-۴۲۳۔ دیگر ائمہ نے بعض جزوی اختلافات کے باوجود اسے جائز قرار دیا ہے۔ تفصیلات سے یہاں بحث نہیں کی گئی ہے۔

کی خرابی یہ ہے کہ جو وسائل و ذرائع موجود ہیں۔ ان کا صحیح استعمال نہیں ہو پاتا اور جو صلاحیتیں پائی جاتی ہیں وہ بھی منجمد پڑی رہتی ہیں جب معاشرہ میں وسائل و ذرائع اور محنت و صلاحیت دونوں سے فائدہ اٹھایا جائے اس کی راہ کی رکاوٹیں دور ہوتی چلی جاتی ہیں اور وہ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگتا ہے۔

مشورہ دینا

انسان قدم قدم پر اچھے مشورہ کا محتاج ہوتا ہے۔ تعلیم، صنعت و حرفت تجارت، زراعت، سفر، مرض و صحت غرض یہ کہ زندگی کے بہت سے معاملات میں اسے مشورے کی ضرورت پیش آتی ہے، موجودہ دور کے قوانین اور ضابطوں نے ہر معاملے میں اتنی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں کہ آدمی اس کے تمام پہلوؤں سے کما حقہٗ واقف نہیں ہو پاتا۔ بعض اوقات صحیح مشورہ نہ ملنے کی وجہ سے بڑی زحمتیں اور نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ اسی وجہ سے مختلف مسائل میں مشورہ دینے کے لیے آج بڑے بڑے ادارے قائم ہیں۔ حدیث میں کسی کو بروقت صحیح اور ٹھیک مشورہ دینے کی فضیلت آئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

من دل علی خیر	جس نے کسی خیر کی طرف رہنمائی کی
فلہ نصف اجر	تو اسے اس پر عمل کرنے والے کا نصف
فاعلہ[1]	ثواب ملے گا۔

اسی طرح جانتے بوجھتے اور دیدہ و دانستہ غلط مشورہ دینے کو خیانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من افتی بغیر	جس شخص کو بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا

---

[1] مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل اعانۃ الغازی فی سبیل اللہ

علم کان اثمہ علی من افتاہ ومن اشار علی اخیہ بامر یعلم ان الرشد فی غیرہ فقد خانہ [1]	(اور اس نے اس پر عمل کیا) تو گناہ اس شخص پر ہوگا جس نے فتویٰ دیا۔ جس نے اپنے بھائی کو یہ جانتے ہوئے کسی بات کا مشورہ دیا کہ اس کا فائدہ اور بھلائی دوسری بات میں ہے تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی۔

موجودہ تہذیب وتمدن نے جو مسائل پیدا کر دیئے ہیں وہ بڑے پیچیدہ ہیں، لیکن ہمارے یہاں ایسے ادارے نہیں ہیں جو ان کے سلسلے میں صحیح رہنمائی کریں اور جدید اسباب دوسائل سے فائدہ اٹھانے کی تدبیریں بتائیں اور اس سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر واضح کریں۔

مظلوم کی مدد کرنا

خدمت خلق کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ معاشرہ میں جن افراد اور طبقات پر ظلم ہو رہا ہو ان کی مدد کی جائے۔ اسلام ہر طرح کے ظلم کے خلاف ہے۔ وہ ایک طرف تو ظلم کے ارتکاب سے سختی سے منع کرتا ہے اور دوسری طرف اس بات کی ہدایت کرتا ہے کہ کسی پر زیادتی ہو تو معاشرہ اسے خاموشی سے برداشت نہ کرے، ظالم کے خلاف آواز اٹھائے، اسے ظلم سے باز رکھے، مظلوم کو اس کی چیرہ دستی سے بچائے اور اس کی ہر ممکنہ مدد کرے[2] حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا۔ اس میں ایک بات یہ تھی کہ مظلوم کی مدد کی جائے[3]

[1] ابوداود، کتاب العلم، باب التوقی فی الفتیا۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ راقم کا مقالہ 'اسلام کمزور کی حفاظت کرتا ہے' تحقیقات اسلامی شمارہ ۲ اپریل جون ۱۹۸۶ء

[3] امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسبع ونہانا عن سبع، امرنا بعیادۃ المریض .... ونصر المظلوم۔ بخاری کتاب الادب باب تشمیت العاطس اذا حمد اللہ۔ مسلم۔ کتاب اللباس والزینۃ، باب تحریم استعمال اناء الذہب الخ

امام نوویؒ نے مظلوم کی مدد کو فرض کفایہ قرار دیا ہے اور اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں شمار کیا ہے[1]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی جان و مال پر زیادتی ہو، اس کی عزت و آبرو پر حملے ہوں، اس کا گھر لوٹا جا رہا ہو یا اس کی جائداد نذر آتش کی جا رہی ہو تو آس پاس کے لوگوں کا فرض ہے کہ اس کی مدد کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ اگر کچھ لوگوں کا خاطر خواہ تعاون اسے حاصل ہو جائے تو یہ فرض سب سے ساقط ہو جائے گا لیکن اگر کسی نے بھی اس کی مدد نہ کی تو سب کے سب گنہ گار ہوں گے۔

مظلوم کی مدد کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، قانونی بھی اور اخلاقی بھی، معاشی حالت کا ٹھیک کرنا بھی اس میں داخل ہے اور نفسیاتی طور پر اسے یہ یقین دلانا بھی اس میں آتا ہے کہ وہ سوسائٹی میں یکا و تنہا نہیں ہے۔ اس پر ظلم ہو تو اسے روکنے کی کوشش کی جائے گی اور اس کی مشکلات میں اس کا ساتھ دیا جائے گا۔ جس سوسائٹی میں مظلوم کی خدمت اور نصرت کا یہ عزم اور حوصلہ ہو وہ وحشت و بربریت سے پاک ہو گی اور اس میں کم زور سے کم زور انسان بھی بے بسی کی زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہو گا۔

---

[1] شرح مسلم ۲/۱۸۸۔ مظلوم کی مدد کن حالات میں فرض ہو جاتی ہے اور کن حالات میں وہ فرض نہیں رہتی۔ صرف اس کا جواز باقی رہتا ہے یا مظلوم کی مدد کب اور کس وقت ہونی چاہیے؟ اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری ۵/۶۱

رفاہی خدمات

ایک فرد اپنی جن ضروریات کی تکمیل کے لیے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے، اسی طرح کی ضرورتیں معاشرہ میں بہت سے افراد کو لاحق ہو سکتی ہیں۔ رفاہی خدمات ان سب کی ضروریات پوری کرنے کے لیے انجام دی جاتی ہیں۔ یہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔ بعض خدمات معاشرہ کی عام ضرورتیں پوری کرتی ہیں۔ ان کا فائدہ کل آبادی یا اس کے بڑے حصہ کو براہ راست پہنچتا ہے۔ بعض خدمات وہ ہیں جو معاشرہ کی خاص خاص ضرورتیں پوری کرتی ہیں لیکن مجموعی طور پر ان سے بھی پوری سوسائٹی کو نفع پہنچتا ہے۔ اسلام نے دونوں قسم کی خدمات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

رفاہی خدمات افراد بھی انجام دیتے ہیں اور ادارے بھی۔ بہت سی خدمات فلاحی ریاست کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔ وہ اپنے وسائل کا بڑا حصہ ان پر صرف کرتی ہے۔ یہاں یہ بحث نہیں ہے کہ ان کے حدود کیا ہیں، کہاں ایک کا دائرۂ عمل ختم ہوتا اور دوسرے کا شروع ہوتا ہے؟ ظاہر ہے وسائل و ذرائع کے لحاظ سے ان کا دائرۂ کار چھوٹا یا بڑا ہوتا چلا جائے گا۔ ان سب کے درمیان اشتراک و تعاون بھی ہو سکتا ہے اور ہونا ہی چاہیے۔ اس سے بہتر اور مفید نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اسلام اپنے تمام احکام میں اصلاً فرد ہی کو خطاب کرتا ہے۔ اس لیے کہ ادارے ہوں یا حکومت، سب کی بنیاد فرد ہی ہے۔ وہی ان کی ہیئت کی تشکیل کرتا اور ان کے مزاج کو بناتا ہے۔ اس معاملہ میں بھی اس نے سب سے پہلے فرد ہی سے خطاب کیا ہے۔

پاکی صفائی کی تعلیم اور انتظام

رفاہی خدمات میں ایک خدمت یہ بھی ہے کہ لوگوں میں پاکی صفائی کا شعور بیدار کیا جائے، اس کی ضرورت اور اہمیت ذہن نشین کرائی جائے، گندگی اور غلاظت کے نقصانات واضح کیے جائیں اور اس سے نفرت پیدا کی جائے۔ چھوٹی بڑی آبادیوں میں صفائی کا اہتمام کیا جائے، اس سلسلے کے مسائل حل کیے جائیں اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ لوگ گندگی میں رہنے پر مجبور نہ ہوں۔ ان سب باتوں کو مغرب کی دین سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس معاملے میں اسلام نے مثالی کردار ادا کیا ہے۔ وہ گندگی سے نفرت اور پاکی صفائی سے محبت کا جذبہ ابھارتا ہے۔ اس کے لیے تعلیم و تربیت اور ترغیب و تشوق سے کام لیتا ہے۔ وہ نظافت و نفاست کا اعلیٰ ترین تصور دیتا اور اس کے مطابق پورے معاشرہ کو تیار کرتا ہے[1]

راستہ سے تکلیف دور کرنا

کسی ملک کی معاشی اور مادی ترقی میں آمد و رفت کے ذرائع کا بڑا دخل ہوتا ہے جہاں راستے صاف ستھرے اور محفوظ و مامون ہوں، سفر کی دشواریاں کم سے کم تر ہوں اور زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور آسانیاں پائی جائیں، وہاں ترقی کے مواقع بھی اسی تناسب سے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اسی مقصد کے لیے سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر ہوتی ہے، پُرخطر راستوں کو سفر کے قابل بنایا جاتا ہے، نشاناتِ راہ لگائے جاتے ہیں، ٹریفک کے قواعد و ضوابط وضع کیے جاتے ہیں، سفر کو حادثات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مسافروں کو سہولت اور آرام پہنچایا جاتا ہے۔

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات باب 'طہارت و نظافت'

موجودہ دور نے فضائی سفر کی راہیں کھول دی ہیں۔ اس کے اپنی نوعیت کے مسائل ہیں اور ان کو حل کرنے کی کوشش بھی مسلسل ہو رہی ہے۔

راستہ کی بڑی بڑی دشواریوں کو دور کرنا اور سفر کو آسان بنانا دراصل ریاست کی ایک بنیادی ذمہ داری ہے۔ دنیا کی ہر فلاحی ریاست اس ذمہ داری کو قبول کرتی ہے لیکن اس میں افراد کا تعاون بہت ضروری ہے۔ جہاں افراد باشعور اور تربیت یافتہ ہوں، ان کے اندر خوفِ خدا اور انسانوں کی خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ ہو، وہاں یہ کام آسان ہوتا ہے۔ ورنہ ہزار تدبیروں کے باوجود سفر دشواریوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ قدم قدم پر زحمتیں اور رکاوٹیں پیش آسکتی ہیں۔ بسا اوقات مسافر سنگین حادثات سے دوچار ہو سکتا ہے۔ ان سب باتوں کے تجربات رات دن ہوتے رہتے ہیں۔

اس طرح کی رفاہی خدمات کی ذمہ داری اسلام کے نزدیک بھی ریاست ہی پر عائد ہوتی ہے، لیکن اس میں فرد کو اس نے شریک کیا ہے اور اس کے کردار کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے۔ اس نے فرد کو جن رفاہی خدمات کی صریح اور واضح الفاظ میں تعلیم دی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ راستوں کو صاف رکھے اور ان پر جو رکاوٹیں ہوں انھیں دور کرے۔ اس سلسلہ کی بعض روایات یہاں پیش کی جا رہی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الایمان بضع وسبعون او بضع وستون شعبۃ فافضلھا قول لا الٰہ الا اللہ وادناھا اماطۃ الاذیٰ عن الطریق والحیاء شعبۃ من الایمان [1]	ایمان کی ستر سے اوپر یا ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں ان میں افضل اور برتر شاخ لا الٰہ الا اللہ کا قول ہے اور ادنیٰ شاخ راستہ سے تکلیف کو دور کرنا ہے حیا بھی ایمان ہی کی ایک شاخ ہے۔

[1] یہ روایت صحیح مسلم کی ہے۔ (کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان) بخاری کے الفاظ میں ـــ

خدا پر ایمان سے آدمی میں مخلوقِ خدا کو راحت پہنچانے کا جذبہ پیدا ہوتا اور پروان چڑھتا ہے۔ ایمان اگر صحیح معنی میں دل میں جاگزیں ہو تو آدمی کی کوشش ہوگی کہ اس کی ذات سے دوسروں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے۔ اسی کا ایک چھوٹا سا پہلو حدیث میں بیان ہوا ہے۔ کوئی بھی صاحبِ ایمان راستہ میں پتھر، کانٹے کوڑا کرکٹ اور گندگی جیسی چیزیں جن سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے، برداشت نہیں کرے گا بلکہ وہ انھیں ہٹا دے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لقد رأیت رجلاً	میں نے ایک شخص کو جنت میں
یتقلب فی الجنة فی	چلتے پھرتے دیکھا (جس کا خاص عمل یہ
شجرة قطعها من ظهر	تھا کہ) اس نے راستہ میں موجود ایک ایسا

ــــ بغیر کسی شک کے کہا گیا ہے۔ الایمان بضع وستون شعبة (کتاب الایمان، باب امور الایمان) یعنی ایمان کی ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں۔ مسلم کی ایک اور روایت میں بغیر شک کے الایمان بضع وسبعون شعبة کہا گیا ہے یعنی ایمان کی ستر سے اوپر شاخیں ہیں۔ یہ روایت ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں بھی ہے۔ بعض شارحین حدیث کے نزدیک امام بخاری کی روایت قابلِ ترجیح ہے۔ اس لیے کہ ساٹھ سے اوپر والی تعداد پر سب ہی روایتیں متفق ہیں لیکن بعض دوسرے شارحین نے ستر سے اوپر والی روایت کو ترجیح دی ہے اس لیے کہ اس میں جو اضافہ ہے وہ ثقہ راویوں کی طرف سے ہے۔ ان کا اضافہ ہمیشہ قبول کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو نووی: شرح مسلم ۱/۴۷

حدیث میں ایمان کی ساٹھ یا ستر سے کچھ زیادہ شاخیں بیان کی گئی ہیں۔ ان کو جمع کرنے کی کوششیں بھی ہوئی ہیں۔ اس کا ایک اچھا سا خلاصہ حافظ ابن حجرؒ نے بیان کیا ہے۔ (فتح الباری: ۱/۴۰-۴۱) غالباً حدیث کا منشا یہ ہے کہ دین کی تفصیلات کو ساٹھ، ستر سے زیادہ عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہاں اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ کا ذکر دیا گیا ہے۔ اس موضوع پر امام بیہقی کی 'شعب الایمان' سب سے جامع کتاب ہے۔

الطريق كانت توذي الناس[1]. | درخت کاٹ دیا تھا جو لوگوں کو تکلیف دے رہا تھا۔

مطلب یہ کہ اس نے لوگوں کے راستے سے ایک تکلیف دور کی تو اس کے لیے جنت کی راہ آسان ہو گئی، اور کسی رکاوٹ کے بغیر جنت کے سبزہ زاروں میں گھومنا اس کے لیے ممکن ہو گیا۔

حضرت ابو ہریرۃؓ ہی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بينما رجل يمشي بطريق وجد غصن شوك على الطريق فاخره فشكر الله فغفر له[2]

ایک شخص نے راستہ چلتے ہوئے ایک خاردار شاخ دیکھی۔ اس نے اسے وہاں سے ہٹا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی قدر کی اور اس کی مغفرت فرمادی۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

مر رجل بغصن شجرة على ظهر الطريق فقال والله لا نحين هذا عن المسلمين لا يوذيهم فادخل الجنة[3]

ایک شخص راستہ سے گزر رہا تھا کہ اس نے اس کے بیچ میں درخت کی ایک بڑی سی شاخ دیکھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ خدا کی قسم میں اسے مسلمانوں کے راستہ سے ہٹا دوں گا تاکہ وہ انھیں اذیت نہ دے۔ اس پر اللہ نے اسے جنت میں داخل کر دیا۔

اوپر کی حدیث میں اس شخص کو جنت کا مستحق قرار دیا گیا تھا جس نے ایک

---

[1] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل ازالۃ الاذی عن الطریق۔

[2] بخاری، کتاب المظالم، باب من اخذ الغصن وما یوذی الناس الخ۔ مسلم حوالۂ سابق

[3] مسلم، حوالۂ سابق

ایسے درخت کو کاٹ دیا تھا جس سے لوگوں کو راستہ میں تکلیف ہو رہی تھی۔ لیکن اس حدیث میں راستہ سے صرف ایک شاخ کے ہٹانے پر اس کی بشارت دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی راہ سے چھوٹی سے چھوٹی تکلیف دور کرنا اور ان کو معمولی سے معمولی فائدہ پہنچانا بھی انسان کو جنت جیسی ابدی نعمت کا حق دار بناتا ہے۔

حضرت ابو برزہ اسلمیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی۔

علمنی شیئا انتفع به	آپ مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجئے جس سے فائدہ اٹھا سکوں۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا:

اعزل الاذی عن طریق المسلمین [1]	مسلمانوں کے راستہ سے تکلیف دور کر دو۔

گو ان احادیث میں صرف راستہ کی تکلیف دور کرنے کا ذکر ہے، لیکن جیسا کہ امام نووی نے لکھا ہے۔

فیه التنبیه علی فضیلة کل ما نفع المسلمین وازال عنهم ضررا [2]	ان میں مسلمانوں کو نفع پہنچانے اور ان کے ضرر اور نقصان کو دور کرنے والے ہر عمل کی فضیلت کی نشاندہی کی گئی ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ ہدایات مسلم معاشرہ کے پیش نظر دی گئی ہیں، اس لیے ان میں مسلمانوں کے راستہ سے تکلیف دور کرنے کا ذکر ہے ورنہ یہ ایک عام حکم ہے۔ کسی بھی انسان کے راستہ سے تکلیف کا دور کرنا کارِ ثواب ہے۔

---

[1] مسلم، حوالۂ سابق۔ ابن ماجہ، ابواب الادب، باب اماطۃ الاذیٰ عن الطریق۔

[2] شرح مسلم ۲/۳۲۸ مطبوعہ ہند

چنانچہ ان ہی روایات میں سے بعض میں 'الناس' کا لفظ آیا ہے جو عام انسانوں کے لیے ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں:

یمیط الاذیٰ الطریق	آدمی راستہ سے تکلیف دور کرتا ہے
صدقۃ[۲]	یہ بھی ایک صدقہ ہے۔

راستہ سے تکلیف دور کرنے کا جو ثواب بیان ہوا ہے، اس حدیث سے اس کی توجیہ ہوتی ہے۔ صدقہ کا مقصد مصیبت میں کسی کی مدد کرنا اور اسے راحت اور آرام پہنچانا ہے۔ راستہ کی تکلیف دور کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسافر کو تکلیف نہ پہنچے اور وہ صحیح و سلامت آسانی کے ساتھ راستہ طے کرے۔ اس لحاظ سے یہ اس پر ایک صدقہ ہے[۳]

راستہ کی تکلیفیں اور رکاوٹیں ہر طرح کی ہوتی ہیں۔ ان کو دور کرنا اور سفر کو آسان بنانا ایک دینی کام ہے اور مسلمان اس پر بہترین اجر و ثواب کی توقع کرسکتا ہے۔

سرائے اور ہوٹل تعمیر کرنا

اسی سے ملتی جلتی خدمت ہوٹلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر ہے، جہاں مسافروں کو بہتر سہولتیں حاصل ہوں اور وطن سے دوری کی وجہ سے انھیں دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت سے اس کا اجر و ثواب اور فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

ان مما یلحق	مومن کے مرنے کے بعد بھی اس کے
المومن من عملہ	جن اعمال اور نیکیوں کا ثواب اسے پہنچتا
وحسناتہ بعد موتہ	رہتا ہے ان میں یہ چیزیں بھی داخل ہیں

---

[۱] مسلم، حوالہ سابق۔ ابوبرزہ اسلمیؓ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔ امط الاذیٰ عن طریق الناس۔ الادب المفرد: ۳۲۴/۱

[۲] بخاری، کتاب المظالم، باب اماطۃ الاذیٰ

[۳] فتح الباری: ۸۰/۵

علما علمه ونشره	وہ علم جس کی اس نے تعلیم دی اور پھیلایا،
وولدا صالحا	نیک اولاد جو اس نے چھوڑی (کیوں کہ
ترکه ومصحفا	اس کو نیکی کی راہ پر لگانے میں اس کی
ورثه او مسجدا بناه	کوششوں کا بھی دخل تھا) قرآن شریف
او بیتا لابن السبیل	جس کا اس نے اپنے بعد کسی کو وارث
او نهرا اجراه او	بنایا۔ یا جو مسجد اس نے بنوائی یا مسافروں
صدقة اخرجها	کے لیے کوئی مکان جو اس نے تعمیر کرایا
من ماله فی صحته	یا نہر جو اس نے کھدوائی یا وہ صدقہ جو
وحیاته یلحقه	اس نے اپنے مال سے صحت کی حالت
بعد موته[1]	میں اپنی زندگی میں نکالا۔ اس کا ثواب
	اسے اس کے مرنے کے بعد بھی ملے گا۔

اس حدیث میں رفاہِ عام کے بعض خاص کاموں کا ذکر ہے اور انھیں صدقاتِ جاریہ کہا گیا ہے۔ ان میں مسافروں کے لیے مکان اور سرائے کی تعمیر بھی ہے۔ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے کاموں میں پیسہ صرف کرنا بہترین صدقہ ہے۔ حضرت ابوامامہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

افضل الصدقات ظل	صدقات میں بہتر صدقہ یہ ہے کہ
فسطاط فی سبیل الله[2]	اللہ کے راستہ میں خیمہ کا سایہ فراہم کیا جائے۔

اس حدیث میں مجاہدوں کے لیے خیموں اور چھولداریوں کے انتظام کرنے کا ثواب بیان ہوا ہے لیکن اس ذیل میں تعلیم و تربیت، دعوت و تبلیغ اور حج وعمرہ جیسے دینی مقاصد کے لیے مراکز قائم کرنا اور عمارتیں بنانا بھی آسکتا ہے۔

---

[1] رواہ ابن ماجہ (باب ثواب معلم الناس الخیر) باسناد حسن والبیہقی و رواہ ابن خزیمۃ فی صحیحہ مثلہ (الترغیب والترہیب ۱ص۲۳)

[2] ترمذی، فضائل الجہاد، باب ماجاء فی فضل الخدمۃ فی سبیل اللہ۔ مسند احمد ۵/۲۷۰

پانی کا نظم کرنا

پانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی صاف پانی کی فراہمی اور ضرورت کے مطابق فراہمی بڑا مسئلہ ہے۔ اسلام نے اس کی طرف جس طرح توجہ دلائی ہے اس کا اندازہ اوپر کی اس روایت سے ہو سکتا ہے جس میں بندگانِ خدا کے لیے نہر کی تعمیر کو صدقۂ جاریہ کہا گیا ہے۔

حضرت سعد بن عبادہؓ کی والدہ کا انتقال ہوا تو انھوں نے چاہا کہ ان کی طرف سے صدقہ و خیرات کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کون سا صدقہ سب سے اچھا ہے؟ آپ نے فرمایا کنواں کھدوا دو۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ماں کے نام سے کنواں کھدوا دیا۔[1]

نہر اور کنواں کھدوانا پانی کی فراہمی کی ایک شکل ہے، جو قدیم زمانے سے رائج ہے۔ موجودہ دور میں ٹیوب ویل اور نل لگائے جاتے ہیں۔ حوض اور ٹینک میں پانی جمع کر کے تقسیم کرنا بھی اس کی ایک صورت ہے۔ اس طرح پانی مہیا کرنے کی تمام اسکیمیں اس میں آسکتی ہیں اور وہ سب اجر و ثواب کی مستحق ہیں۔

زمین کو آباد کرنا

بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانا اور اس میں مدد دینا بھی ایک رفاہی خدمت ہے۔ اس سے مجموعی طور پر پوری قوم اور پورے ملک کو فائدہ پہنچتا ہے۔ حکومت خود بھی غیر آباد زمینوں کو آباد کر کے اس کی آمدنی فلاح و بہبود کے کاموں میں لگا سکتی ہے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب فی فضل سقی الماء۔ نسائی، کتاب الوصایا، باب فضل الصدقۃ عن المیت
اس روایت کے راوی حضرت سعید بن مسیبؒ اور حسن بصریؒ کی حضرت سعد بن عبادہؓ سے ملاقات ثابت نہیں ہے اس لیے یہ روایت حدیث کی اصطلاح میں منقطع ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ جو لوگ انھیں آباد کرنا چاہیں انھیں اس کی اجازت دی جائے اور آسانیاں فراہم کی جائیں۔ اسلام نے اس بات کی ترغیب دی ہے اور اسے کارِ ثواب بتایا ہے کہ بنجر اور افتادہ زمینوں کو قابل کاشت بنایا جائے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من احییٰ ارضا میتۃ	جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا
فلہ فیھا اجرھا	اسے اس کا اجر ملے گا اس سے ضرورت مند
وما اکلت العافیۃ	مخلوق (انسان، جانور، پرندے وغیرہ) جو
منھا فھو لہ صدقۃ[1]	کچھ کھائے وہ سب اس کی طرف سے
	صدقہ ہے (اس کا اسے اجر ملے گا۔)

کسی افتادہ زمین کو آدمی اپنی محنت سے زرخیز بنائے تو اس کا فائدہ اصلاً اس کی ذات اور اس کے خاندان کو پہنچتا ہے، لیکن یہ محنت ایک جائز مقصد کے لیے کی جاتی ہے اس لیے وہ اجر و ثواب کا مستحق ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اس سے خدا کی جو مخلوق بھی فائدہ اٹھاتی ہے وہ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس محنت سے انسانوں کو اور پورے معاشرہ کو جو فائدہ پہنچے گا اس کا کتنا بڑا اجر ہوگا؟

موجودہ دور کی رفاہی حکومتیں بھی افتادہ زمینوں کو قابل کاشت بنانے میں سہولتیں فراہم کرتی ہیں۔ اسلام نے اس سے آگے یہ اقدام کیا کہ جو شخص اس طرح کی زمین کو آباد کرے اس پر اسے مالکانہ حقوق دے دیے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من احییٰ ارضا میتۃ	جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا
فھی لہ[2]	وہ اسی کی ہے

---

[1] مسند احمد: ۳/۳۲۷

[2] ترمذی، کتاب الاحکام، باب ما ذکر فی احیاء الموات

یہی بات حضرت عمرؓ نے بھی فرمائی ہے[1]۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل ہدایات دی گئی ہیں تاکہ فرد کے حقوق اور معاشرہ کے مفادات کو نقصان نہ پہنچے۔

۱۔ کسی دوسرے کی زمین کو افتادہ قرار دے کر اس پر قبضہ نہیں کیا جائے گا۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من اعمر ارضا لیست لاحد فھو احق[2]	جس نے کسی ایسی زمین کو آباد کیا جس کا کوئی مالک نہیں ہے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی زمین کو آباد کرنے سے آدمی کا اس پر حق اسی وقت تسلیم کیا جائے گا جب کہ وہ کسی دوسرے کی ملکیت نہ ہو۔ حضرت سعید بن زیدؓ کی روایت زیادہ واضح ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

من احییٰ ارضا میتۃ فھی لہ ولیس لعرق ظالم حق[3]	جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اسی کی ہے البتہ ظالم رگ (ظلم سے کی ہوئی کھیتی) کا کوئی حق نہیں ہے۔

مطلب یہ کہ غیر آباد زمین کو آباد کرنے والا اس کا مالک ہوگا لیکن اس بہانہ سے دوسرے کی زمین پر قبضہ کرنا اور اس میں کاشت شروع کر دینا ناجائز ہے۔ یہ صریح ظلم ہے اور ظلم کی کسی حال میں اجازت نہیں ہے۔

اوپر کی اسی حدیث کے ذیل میں ذکر آتا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے کی زمین میں کھجور کے درخت لگوا لیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مقدمہ پیش ہوا تو آپؐ نے فیصلہ فرمایا کہ زمین اس کے مالک کی ہے اور جس کے درخت

---

[1] موطا، کتاب الاقضیۃ، باب القضاء فی عمارۃ الموات و رواہ البخاری تعلیقاً۔ کتاب الحرث والمزارعۃ۔ باب من احییٰ ارضا مواتا

[2] بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ، باب من احییٰ ارضا مواتا۔

[3] ابوداؤد، کتاب الخراج والفئی والامارۃ، باب احیاء الموات۔ ترمذی، ابواب الاحکام، باب ما ذکر فی احیاء الموات۔

تھے اسے حکم دیا کہ وہ ان درختوں کو کٹوا کر لے جائے۔ چنانچہ درخت کٹوا دیے گئے۔[1]

اس سے فقہ کے اس جزئیہ کی تائید ہوتی ہے کہ کسی غیر آباد زمین کے مالک کا پتہ نہ چلے اور اسے آباد کر لیا جائے تو مالک کا پتہ چلنے پر زمین واپس کر دی جائے گی اور مالکِ زمین کا جو نقصان ہوا ہے زمین کا آباد کرنے والا اس کی تلافی کرے گا۔[2]

۲- فقہ حنفی کی رو سے افتادہ زمین وہ ہے جو آبادی سے دور ہو۔ جو زمین آبادی سے قریب ہو اس سے آبادی کے بہت سے مفادات وابستہ ہوتے ہیں لہٰذا آبادکاری کے احکام اس سے متعلق نہ ہوں گے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ غیر آباد زمین کو آباد کرنے کے لیے اسلامی ریاست کے سربراہ یا امام کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بھی شخص اسے آباد کرے اس کا حق اس پر تسلیم کیا جائے گا لیکن امام ابو حنیفہؒ نے امام کی رائے کو ضروری قرار دیا ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جو زمین آبادی سے قریب ہو اس کے لیے تو امام کی اجازت ضروری ہے لیکن جو زمین دور ہو اس کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔[3]

۳- کسی نے زمین پر حدبندی کر لی اور تین سال تک اسے آباد نہیں کیا تو اسلامی ریاست اس سے زمین واپس لے لے گی اور دوسرے شخص کو دے دے گی۔ اس لیے کہ پہلے شخص کو زمین اس لیے دی گئی تھی تاکہ وہ اسے آباد کرے اور عشر و خراج کے ذریعہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔ محض حدبندی کو زمین کی آبادکاری نہیں کہا جا سکتا۔[4]

اس کی تائید حضرت عمرؓ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

من عطل ارضا ثلاث	جس نے زمین تین سال تک آباد
سنین لم یعمرها	کیے بغیر چھوڑے رکھی اور کسی دوسرے نے

---

[1] ابوداؤد، حوالہ سابق

[2] ہدایہ: ۴/۴۲۸

[3] ملاحظہ ہو ہدایہ حوالہ سابق۔ فتح الباری: ۵/۱۲

[4] ہدایہ حوالہ سابق

فجاء غیرہ فعمرھا فھی لہ[۱] اگر اسے آباد کرلی تو وہ اسی کی ہوگی۔

۴۔ آباد کاری کے مفہوم میں کاشت اور کھیتی بھی ہے اور مکان کی تعمیر بھی۔ فقہ حنفی کی رو سے اس کے ابتدائی اقدامات بھی اس میں آتے ہیں[۲]

۵۔ افتادہ زمین کو آباد کرنے کا حق مسلمانوں کی طرح ذمیوں کو بھی حاصل ہوگا۔[۳]

غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے کے سلسلے میں اسلامی قانون میں بڑی تفصیلات موجود ہیں۔ یہاں اس کے صرف بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

درخت لگانا

غذا، صحت اور تندرستی کے نقطۂ نظر سے درختوں کی اہمیت بہت واضح ہے۔ ان سے صاف ستھری اور تازہ ہوا ملتی ہے، وہ ٹھنڈا اور فرحت بخش سایہ فراہم کرتے ہیں، بہت سے درختوں کے پھولوں اور پتوں میں انسانوں اور جانوروں کی غذا اور علاج ہے۔ ان میں وہ درخت بھی ہیں جو عمدہ اور نفیس پھل پیدا کرتے ہیں جو بہترین غذائیت کے حامل ہیں اور جن کا بدل انسان کے پاس نہیں ہے۔ ان کی سوکھی لکڑی تعمیرات میں کام آتی ہے، ایندھن میں استعمال ہوتی ہے اور بھی بہت سے فائدے اس سے اٹھائے جاتے ہیں۔

جنگلات کے فوائد اور ان کے اثرات سے بھی ہم سب واقف ہیں۔ ان سے بارش بروقت ہوتی ہے، موسم میں مناسب اور خوش گوار تبدیلی آتی ہے، آلودگی اور کثافت دور ہوتی ہے۔ وہ سیلاب کی روک تھام کا بھی ذریعہ ہیں۔ یہی نہیں جنگلات کے اور بھی فوائد ہیں۔

زمین کی آباد کاری میں درخت لگانا اور باغات کا تیار کرنا بھی آتا ہے۔ احادیث

---

[۱] فتح الباری: ۱۴/۵

[۲] ہدایہ: ۴/۴۷۷

[۳] ہدایہ: ۴/۴۷۷

میں الگ سے بھی اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ حضرت انس رضؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مامن مسلم یغرس غرسا او یزرع زرعا فیاکل منه طیر او انسان او بهیمة الا کان له به صدقة[1]	مسلمان جو پودا لگاتا یا کھیتی کرتا ہے اس سے پرندے، انسان یا جانور کچھ کھاتے ہیں تو یہ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔

اسی مفہوم کی ایک روایت صحیح مسلم میں حضرت جابر رضؓ سے مروی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

ما من مسلم یغرس غرسا الا کان ما اکل منه له صدقة وما سرق منه له صدقة وما اکل السبع فهو له صدقة وما اکلت الطیر فهو له صدقة ولا یرزؤه احد الا کان له صدقة[2]	مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو اس سے جو کچھ کھایا جاتا ہے وہ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔ (یہاں تک کہ) جو اس سے چوری ہو جائے وہ (بھی) صدقہ ہے، جو جنگل کے درندے کھا جائیں وہ (بھی) صدقہ ہے، پرندے جو کھائیں وہ بھی صدقہ ہے۔ کوئی شخص اس میں سے کچھ لے لے تو وہ بھی صدقہ ہے۔

حضرت انس رضؓ کی حدیث کے ذیل میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:۔

وفی الحدیث فضل الغرس والزرع والحض علی عمارة الارض۔	اس حدیث میں درخت لگانے اور کھیتی کرنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے اور زمین کو آباد کرنے کی ترغیب پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اس سے زرخیز زمین رکھنے اور اس میں قیام کا

---

[1] بخاری، کتاب الحرث والمزارعة، باب فضل الزرع الخ

[2] مسلم، کتاب المساقاة والمزارعة، باب فضل الغرس والزرع

بھی ثبوت ملتا ہے۔ اس سے ان غلط قسم کے زاہدوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے جو ان کاموں کو ناپسند کرتے ہیں۔ بعض روایات سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کاموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ آدمی ان میں لگ کر دینی امور سے غافل ہو جائے۔[1]

حضرت معاذؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من بنی بنیانا فی غیر ظلم	جس شخص نے کسی پر ظلم وزیادتی کے
ولا اعتداء او غرس غرسا فی	بغیر کوئی عمارت بنائی یا ظلم وزیادتی سے بچتے
غیر ظلم ولا اعتداء کان له اجر جار	ہوئے کوئی درخت لگایا تو اس کے لیے جاری
ما انتفع به من خلق الله تبارک	رہنے والا اجر ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی
و تعالیٰ[2]	مخلوق اس سے فائدہ اٹھائے۔

درخت لگانے یا باغات تیار کرنے کا کام انسان اپنے ذاتی فائدہ کے لیے بھی کر سکتا ہے۔ اس کا بھی ثواب ہے، لیکن اگر یہی کام عام انسانوں کے فائدے کے لیے ہو تو اس کا اجر وثواب بھی اسی قدر زیادہ ہے۔ یہ صدقہ جاریہ کی ایک صورت ہے۔ یعنی آدمی کے مرنے کے بعد بھی اس کے لگائے ہوئے درخت سے جب تک لوگ فائدہ اٹھائیں گے اسے ثواب ملتا رہے گا۔ مسلم کی جو روایت ابھی گزر چکی ہے، اس میں "الی یوم القیامۃ" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یعنی قیامت تک اسے اس کا ثواب پہنچتا رہے گا۔ ایک درخت لگایا جائے تو اس سے بہت سے دوسرے درخت وجود میں آسکتے ہیں۔ اسی طرح کسی چیز کی تھوڑی سی کھیتی مزید کھیتی کا سبب بن سکتی ہے۔ جب تک یہ باقی ہے ثواب جاری رہے گا اس لیے کہ خدا کی مخلوق اس سے فائدہ اٹھاتی رہے گی۔ یہ سلسلہ قیامت تک دراز ہو سکتا ہے۔[3]

---

[1] فتح الباری: ۵/۳

[2] مسند احمد: ۳/۴۳۸

[3] نووی: شرح مسلم: ۲/۱۵

ایک شخص نے دمشق میں حضرت ابو درداءؓ کو دیکھا کہ وہ درخت لگا رہے ہیں عرض کیا کہ آپ صحابیٔ رسولؐ ہیں اور اس (دنیاداری) میں لگے ہوئے ہیں۔ حضرت ابو درداءؓ نے فرمایا، اعتراض کرنے میں جلدی مت کرو (یہ تو ایک کارِ ثواب ہے جس میں میں مصروف ہوں) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنا ہے۔

من غرس غرسا لم	اگر کوئی شخص درخت لگائے اور
یأکل منه آدمی ولاخلق	اس کے پھل سے آدمی یا اللہ کی کوئی مخلوق
من خلق الله الا کان له	فائدہ اٹھائے تو یہ اس کے حق میں ایک صدقہ
صدقة[1]	ہے۔

ان احادیث میں جو فضیلت بیان ہوئی ہے اس میں، راستہ میں سایہ دار درختوں کا لگانا، رفاہ عام کے لیے باغات تیار کرنا، پارک بنوانا اور جنگلات کا تحفظ اور ان کی دیکھ بھال بھی آسکتی ہے۔

مساجد کی تعمیر

مسجد اصلاً اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہے۔ اس کی تعمیر براہِ راست عبادت میں تعاون ہے۔ لیکن دورِ اول میں مساجد عبادت کے علاوہ مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور سیاسی مراکز کی بھی حیثیت رکھتی تھیں ــــ ان کی یہ حیثیت اب بہت کچھ بدل چکی ہے اس لئے رفاہی خدمات کے ذیل میں ان کا ذکر ضرور کیا جا سکتا ہے۔ مسجد کی تعمیر کا ثواب حضرت عثمانؓ کی ایک روایت میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

قال رسول الله صلی الله علیه	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
وسلم من بنی مسجدا یبتغی	کہ جس کسی نے اللہ کی رضا کی طلب میں کوئی
به وجه الله بنی الله له مثله	مسجد بنائی تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اسی طرح

---

[1] مسند احمد ۶/۴۴۴

[2] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب من بنی مسجداً۔ مسلم، کتاب المساجد، باب فضل بناء المساجد

فی الجنۃ[1] کا (گھر) جنت میں بنائے گا۔

مدارس کا قیام

قوموں کی ذہنی اور فکری تعمیر میں تعلیم بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لیے کسی قوم میں جو رفاہی خدمات انجام دی جاتی ہیں ان میں تعلیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام نے اس اہمیت کو تسلیم کیا اور اس کے فروغ کی پوری کوشش کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی توسیع و اشاعت کو ایک دینی فریضہ قرار دیا اور ہدایت فرمائی کہ جو شخص دین کا جتنا کچھ بھی علم حاصل کرے اسے دوسروں تک پہنچائے۔ موجودہ دور میں علم کے فروغ کا بڑا ذریعہ تعلیمی ادارے اور درس گاہیں ہیں۔ یہیں سے وہ افراد تیار ہوتے ہیں جو علم و فن، تہذیب و تمدن اور معیشت و سیاست کے مختلف شعبوں کو چلاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس طرح کے ادارے الگ سے تو نہیں تھے، البتہ مساجد سے علم کی روشنی چاروں طرف پھیلتی تھی۔ وہاں تعلیمی مجلسیں ہوتی تھیں، علمی حلقے قائم تھے اور درس و تدریس کا فرض انجام پاتا تھا[2] بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ جہاں خالص دینی علوم کے ساتھ ان کی روشنی میں وقت کے افکار و نظریات کی بھی تدریس ہوتی تھی۔ ان اداروں نے امت کے بہت سے مفکرین اور مجتہدین پیدا کیے۔

شفاخانوں کا قیام

اسلام سے پہلے عرب میں لوگ اپنا علاج خود کرتے یا کراتے تھے۔ یہ ایک لحاظ سے ہر شخص کا ذاتی یا زیادہ سے زیادہ اس کا خاندانی مسئلہ تھا، جسے وہ اپنی طاقت اور وسائل کے لحاظ سے حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ عوامی شفاخانوں یا اسپتالوں کا وجود نہیں تھا۔

---

[1] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب من بنی مسجداً۔ مسلم، کتاب المساجد، باب فضل بناء المساجد

[2] اس کی کسی قدر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ ’محمد عربی ﷺ کے علمی احسانات‘، مطبوعہ، ترماہی تحقیقات اسلامی جنوری۔ مارچ ۱۹۸۶ء

اسلام کے آنے کے بعد بھی عرصہ تک یہی صورتِ حال رہی، لیکن اس نے خدمت کا جو جذبہ پیدا کیا، اس کے نتیجہ میں یوں کہنا چاہیے کہ اس طرح کے شفاخانوں کی بھی بنیاد پڑ گئی۔ رفیدہ نامی ایک صحابیہ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے مسجد نبوی کے پاس ایک خیمہ لگا رکھا تھا، جس میں وہ محض ثواب کی خاطر جنگ میں زخمی ہونے والے ان افراد کی مرہم پٹی اور علاج کرتی تھیں۔ جن کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ حضرت سعد بن معاذؓ جنگ خندق میں زخمی ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قوم سے کہا کہ وہ انھیں اسی خیمہ میں رکھیں تاکہ وہ قریب رہیں اور عیادت کرنے میں آپؐ کو آسانی ہو۔[1]

اس سے وقت ضرورت دوا علاج کے لیے کیمپ لگانے کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ شفاخانے اسی ضرورت کو چونکہ مستقل طور پر پورا کرتے ہیں، اس لیے اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کا ان کی تعمیر و ترقی میں بڑا حصہ رہا ہے۔

رفاہی کاموں کے لیے وقف کی فضیلت

رفاہی کاموں کے لیے زمین، جائداد اور اپنی قیمتی چیزوں کے وقف کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ ان کاموں کو جاری رکھنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی ہے اور وقف

[1] ابن ہشام: سیرۃ النبیؐ: ۳/۲۵۸۔ نیز ملاحظہ ہو فتح الباری: ۷/۲۹۰۔ حضرت سعد بن معاذؓ کا یہ واقعہ بخاری کی ایک روایت میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ فضرب النبیؐ خیمۃ فی المسجد لیعودہ من قریب کتاب الصلوٰۃ، باب الخیمۃ فی المسجد (رسول اللہؐ نے مسجد نبوی میں حضرت سعد کے لیے خیمہ لگوایا تھا تاکہ قریب سے عیادت کر سکیں) رفیدہؓ کا یہ خیمہ زخمیوں کی مرہم پٹی اور خدمت کے لیے تھا اور اسی میں حضرت سعدؓ رکھے گئے تھے، اس لیے راوی نے غالباً اسے اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ خیمہ گویا ان کے لیے لگا تھا۔ بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں اسے بنو غفار کا خیمہ کہا گیا ہے۔ کتاب المغازی، باب مرجع النبیؐ من الاحزاب۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ رفیدہ کے شوہر کا تعلق بنو غفار سے ہو اس وجہ سے اسے بنو غفار کا خیمہ کہا گیا ہو۔ فتح الباری: ۷/۲۹۲

کرنے والے کے لیے صدقۂ جاریہ بھی۔ صدقۂ جاریہ سے متعلق بعض روایات اس سے پہلے گزر چکی ہیں۔ یہاں ایک اور حدیث پیش کی جارہی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعو له[1]۔

جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے، البتہ تین صورتیں ایسی ہیں جن میں اس کے اعمال باقی رہتے ہیں اور اسے ثواب ملتا رہتا ہے۔ وہ یہ ہیں صدقۂ جاریہ، اس کا وہ علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں اور صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہتی ہے۔

امام نووی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:-

الصدقة الجارية وهى الوقف[2]

صدقۂ جاریہ سے مراد وقف ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

فيه دليل لصحة اصل الوقف وعظيم ثوابه[3]

اس میں وقف کے صحیح ہونے اور اس کے ثوابِ عظیم کی دلیل موجود ہے۔

وقف کی مختلف شکلوں کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ثبوت ملتا ہے۔ ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔

۱۔ اسلام نے فلاحی کاموں کا جو اجر و ثواب بیان کیا ہے اس کی طلب میں صحابۂ کرامؓ نے اپنی بہترین اور محبوب ترین چیزیں وقف کردیں۔

حضرت عمرؓ کو بطور غنیمت خیبر میں ایک زمین ملی۔ بعض روایات میں اس

---

[1] مسلم، کتاب الوصیۃ، باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاتہ۔

[2] شرح مسلم: ۴۱/۲

[3] حوالۂ سابق

کا نام ثمغ آتا ہے) وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ خیبر میں جو زمین میرے حصہ میں آئی ہے اس سے نفیس اور قیمتی چیز مجھے کبھی نہیں ملی۔ میں اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں دینا چاہتا ہوں۔ ارشاد ہو کہ اس کی بہتر صورت کیا ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا:

ان شئت حبّست اصلہا وتصدّقت بہا۔

اگر تم پسند کرو تو اس کی اصل وقف کر دو اور اس کی آمدنی کو صدقہ کر دو۔

حضرت عمرؓ نے آپؐ کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے اسے اس طرح وقف کیا۔

انہ لا یباع اصلہا ولا یوھب ولا یورث، فی الفقراء والقربیٰ والرقاب وفی سبیل اللہ والضیف وابن السبیل لاجناح علی من ولیہا ان یأکل منہا بالمعروف او یطعم صدیقا غیر متمول فیہ [1]

اس کی اصل نہ تو فروخت کی جائے گی اور نہ ہبہ کی جائے گی اور نہ کوئی اس کا وارث ہی ہوگا۔ اس کی آمدنی صدقہ ہوگی محتاجوں اور قرابت داروں پر (جو اس کے مستحق ہوں گے) غلاموں کے آزاد کرنے اور اللہ کے راستہ (جہاد) میں۔ یہ مہمانوں اور مسافروں پر بھی خرچ ہوگی۔ جو شخص اس کی دیکھ بھال کرے وہ معروف کے مطابق اس کی آمدنی سے خود بھی کھا سکتا ہے اور دوستوں کو بھی کھلا سکتا ہے البتہ اس سے دولت جمع نہیں کرے گا۔

اس حدیث سے وقف کے جو احکام نکلتے ہیں وہ اس وقت زیر بحث نہیں ہیں۔ یہاں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عوامی فلاح و بہبود کے کاموں کے لیے بھی وقف ہوتا تھا اور یہ وقف اسی نوعیت کا تھا۔

---

[1] بخاری، کتاب الوصایا، باب الوقف کیف یکتب۔ مسلم، کتاب الوصایا، باب الوقف

۲۔ مسلمانوں کی دینی اور اجتماعی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بعض صحابہ نے اپنی مشترک جائیداد وقف کر دی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچنے کے بعد جب مسجد (نبوی) کی تعمیر کا ارادہ فرمایا تو اس کے لیے جس جگہ کا انتخاب فرمایا وہ بنو نجار کی تھی۔ آپؐ نے ان کے ذمہ داروں کو طلب فرمایا اور اس کی قیمت دریافت کی۔ ان لوگوں نے عرض کیا۔

لا واللہ لا نطلب ثمنہ الا الی اللہ[1] — ہمیں اس کی قیمت نہیں چاہیئے خدا کی قسم ہم تو اس کی قیمت صرف اللہ تعالیٰ سے چاہتے ہیں۔

اس طرح مسجد نبوی وقف کی زمین پر تعمیر ہوئی۔ اس سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ جو چیز ایک سے زیادہ افراد کی ملکیت ہو ان سب کی مرضی سے وہ وقف کی جا سکتی ہے۔[2]

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی اجتماعی ضرورت یا رفاہی خدمت کی طرف توجہ دلائی اور وہ وقف کے ذریعہ پوری کر دی گئی۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص مسجد (مسجد نبوی) کی توسیع کے لیے فلاں زمین خرید کر وقف کر دے تو اسے جنت میں اس سے

---

[1] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب ہل تنبش قبور مشرکی الجاہلیۃ الخ۔ مسلم۔ کتاب المساجد

[2] امام بخاری نے اپنی صحیح کی 'کتاب الوصایا' میں اس پر ان الفاظ میں باب باندھا ہے۔ 'اذا وقف جماعۃ ارضا مشاعا فہو جائز' یعنی اگر مشترکہ زمین اس کے مالک وقف کر دیں تو یہ جائز ہے۔ واقدی کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے زمین کے مالکوں کو قیمت دے دی تھی اور یہ دس دینار تھی۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے تو امام بخاری کا استدلال بہرحال صحیح ہوگا۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نجار کی پیش کش رد نہیں فرمائی تھی کہ اس کی ملکیت میں متعدد افراد شریک ہیں اور یہ وقف نہیں کی جا سکتی۔ فتح الباری ۲۵۸/۵۔ ابن ہبیرہؒ نے لکھا ہے کہ اس بات پر ائمۂ اربعہ کا اتفاق ہے کہ مشترکہ چیز وقف کی جا سکتی ہے۔ الافصاح عن معانی الصحاح ۵۲/۲۔ اس موضوع پر فقہاء کے خیالات کے لیے ملاحظہ ہو۔ نیل الاوطار ۱۳۳/۶۔ ابن قدامہ: المغنی ۶۴۴/۵-۶۴۳۔

بہتر زمین ملے گی۔ حضرت عثمانؓ نے یہ زمین اپنے پیسے سے خرید کر دے دی۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں میٹھے پانی کا ایک ہی کنواں تھا جسے بئرِ رومہ کہا جاتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا جو شخص اسے خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دے اور اس میں اس کا بھی اتنا ہی حصہ ہو جتنا ایک عام مسلمان کا ہوتا ہے تو اسے اس سے بہتر چیز جنت میں ملے گی۔ حضرت عثمانؓ نے اسے خرید کر وقف فرما دیا۔[2]

۴۔ میت کی طرف سے وقف کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا تاکہ اس کا ثواب اسے برابر پہنچتا رہے۔ آپؐ کے دور میں اس پر عمل بھی ہوا۔ چنانچہ حضرت سعد بن عبادہؓ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری والدہ (عمرہ بنتِ مسعودؓ) کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس وقت میں موجود نہیں تھا۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا انھیں اس کا ثواب ملے گا۔ آپؐ نے فرمایا ہاں ضرور ملے گا۔ انھوں نے عرض کیا:

انی اشہدک   میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ

---

[1] ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب عثمان۔ نسائی، کتاب الاحباس، باب وقف المساجد

[2] حوالہ سابق۔ درواہ البخاری تعلیقاً، کتاب المزارعۃ، باب من رای صدقۃ الماء وھبتہٗ ووصیتہٗ جائزۃ
بئرِ رومہ ایک روایت کے مطابق رومۃ الغفاری کا تھا۔ ان کی طرف منسوب ہو کر وہ بئرِ رومہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام لے آئے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے پینتیس ۳۵ ہزار درہم میں خرید کر اسے وقف کیا تھا۔ نووی: تہذیب الاسماء واللغات (القسم الثانی) ۱/۲۶۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یہ ایک کنویں یا چشمہ کا نام تھا۔ اس کا مالک بنو غفار کا ایک شخص تھا۔ وہ ایک مُد (ایک چھوٹا پیمانہ) غلہ کے عوض ایک مشک پانی فروخت کرتا تھا۔ رسول اللہؐ نے اس سے کہا کہ تم مجھے یہ دے دو جنت کا چشمہ تمھیں اس کے عوض میں ملے گا۔ اس نے عرض کیا کہ میرے بچوں کے گزر بسر کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ حضرت عثمانؓ کو اطلاع ملی تو انھوں نے مذکورہ بالا رقم میں اسے خرید کر وقف کر دیا۔ نیل الاوطار: ۶/۱۳۱

ان حائطی المخراف صدقۃ علیہا [1] — میرا فلاں پھل دار باغ میری ماں کی طرف سے صدقہ ہے۔

رفاہ عام کے کاموں کے لیے وقف کا رواج مسلمانوں میں ہر دور میں رہا ہے۔ اس سے ان کاموں کے جاری رکھنے میں بڑی مدد ملتی رہی ہے۔

رفاہی خدمات سے متعلق اسلام کی جو تعلیمات اوپر پیش کی گئی ہیں ان کی تکمیل بعض دوسری ہدایات سے ہوتی ہے۔

عوامی ملکیت کو نقصان نہ پہنچایا جائے

اسلام نے ایک طرف تو شجر کاری کی ترغیب دی ہے، دوسری طرف اس بات سے منع کیا ہے کہ کسی پھل دار یا سایہ دار درخت کو کاٹ دیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن حبشیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

من قطع سدرۃ صوّب اللہ راسہ فی النار۔ — جس نے بیری کا کوئی درخت کاٹا اللہ تعالیٰ اسے سر کے بل جہنم میں ڈال دے گا۔

بیری کا درخت آدمی کی ملکیت ہو تو اسے کاٹ سکتا ہے اور ذاتی فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔ یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہاں اس درخت کے کاٹنے پر وعید

---

[1] بخاری کتاب الوصایا، باب اذا قال ارضی او بستانی للہ۔ بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے اپنی ماں کی نذر کے بارے میں دریافت کیا تھا کہ وہ انتقال کر گئیں اور نذر پوری نہ کر سکیں۔ آپؐ نے فرمایا تم ان کی طرف سے نذر پوری کر دو۔ کتاب الوصایا، باب ما یستحب لمن توفی الخ۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے حضرت سعدؓ نے اپنی ماں کی نذر اور ان کی طرف سے صدقہ، دونوں ہی باتوں کے بارے میں آپ سے دریافت کیا ہو۔ اوپر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ماں کی طرف سے باغ کا صدقہ کیا تھا نسائی میں ہے کہ انھوں نے آپ کے مشورے سے کنواں کھدوایا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کی ماں نے غلام آزاد کرنے کی نذر مانی تھی۔ فتح الباری: ۵/۲۵۲-۲۵۳۔ اس سلسلہ کی روایات کے لیے دیکھی جائے۔ نسائی، کتاب الوصایا باب فضل الصدقۃ عن المیت۔

سنائی گئی ہے جو کسی کی ذاتی ملکیت نہ ہو اور جس سے عوام کا مفاد وابستہ ہو۔

امام ابوداؤد نے اس حدیث کی روایت کی ہے۔ وہ اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

من قطع سدرة في فلاة يستظل بها ابن السبيل والبهائم عبثا وظلما بغير حق يكون له فيها صوب الله راسه في النار[1]	جو شخص بیری کا وہ درخت کاٹے جو میدان میں ہو، جس سے مسافر اور جانور سایہ حاصل کرتے ہوں۔ یہ کاٹنا بے وجہ اور ظلم و زیادتی سے ہو اور اس درخت پر اس کا کوئی حق نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے سر کے بل جہنم میں ڈال دے گا۔

اس سے یہ استدلال غلط نہ ہوگا کہ عوامی ملکیت کی کسی چیز کو نقصان پہنچانا گناہ کا باعث ہے۔ اس لیے کہ یہ خدا کی مخلوق کو اذیت اور تکلیف پہنچانے اور اسے جو راحت اور آسائش پہنچ سکتی ہے اسے ختم کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ حرکت اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت مبغوض اور ناپسندیدہ ہے۔

وہ وسائلِ حیات جو سب کی ملکیت ہیں

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس زمین پر انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے جو ذخائر موجود ہیں اور جن کے پیدا کرنے میں کسی شخص کی محنت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ سب کے لیے ہیں اور سب ہی ان سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

المسلمون شركاء في ثلاث	تین چیزوں میں سارے مسلمان شریک

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی قطع السدر۔ اس موضوع سے متعلق بعض اور روایات اور ان کے سیاق و سباق کے لیے ملاحظہ ہو۔ بیہقی: السنن الکبریٰ: ۶/۱۴۰-۱۴۱

فی الماء والکلاء والنار[1] ہیں۔ پانی، چارہ اور آگ۔
اس حدیث میں پانی سے قدرتی چشموں، دریاؤں، ندیوں اور تالابوں وغیرہ کا پانی مراد ہے۔ اسی طرح جانوروں کا وہ چارہ جو جنگلوں اور میدانوں میں پایا جاتا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کا سب کو حق حاصل ہے۔ آگ سے ایندھن میں کام آنے والی لکڑی اور آگ جلانے کا سامان چقماق وغیرہ مراد لیے گئے ہیں[2]

قومی اہمیت کے وسائل سب کے لیے ہیں

قومی اور ملکی اہمیت رکھنے والے وسائل حیات کسی فرد کی ملکیت نہیں ہوں گے بلکہ ان سے سب کو فائدہ اٹھانے کے برابر کے مواقع حاصل ہوں گے۔ ابیض بن حمالؓ بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ مارب (یمن کا ایک حصہ) میں نمک کی جو کان ہے وہ انھیں عطا کردی جائے۔ آپ نے وہ کان انھیں دے دی۔ جب وہ واپس ہوئے تو ایک شخص (اقرع بن حابس) نے عرض کیا کہ آپ نے انھیں ایک ایسی کان عطا فرمادی جو پانی کے ذخیرہ کی طرح ہے وہاں کا ہر شخص اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس پر آپ نے وہ کان ان سے واپس لے لی اور عوام کے فائدے کے لیے وقف کردی۔ (ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ نے انھیں اس کے عوض ایک زمین اور باغ عطا فرمایا۔)

ابیض بن حمالؓ نے ایک سوال یہ بھی کیا کہ 'اراک' (جس کے پتے اونٹ کے چارہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں) کے کس علاقہ کو حد بندی کے ذریعہ اپنی ملکیت

---

[1] یہ حدیث ابوداؤد میں ایک مہاجر صحابی سے مروی ہے۔ نام کی صراحت نہیں ہے۔ (کتاب البیوع، باب فی منع الماء) البتہ ابن ماجہ میں یہی روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آئی ہے۔ ابواب الرہون، باب المسلمون شرکاء فی ثلاث۔ ابوداؤد کی روایت صحیح ہے لیکن ابن ماجہ کی روایت میں ضعف ہے۔

[2] اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو نیل الاوطار: ۶/۴۹-۵۰

میں لیا جا سکتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ جہاں اونٹوں کے قدم نہ پہنچیں (یعنی جو آبادی سے دور ہو) [1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست بھی اس طرح کا کوئی اقدام نہیں کرے گی کہ جن وسائلِ حیات سے عام لوگوں کا مفاد وابستہ ہے ان پر کسی ایک یا چند افراد کا قبضہ ہو جائے اور دوسرے ان سے محروم رہیں۔

فقہا نے لکھا ہے کہ حاکم وقت ایسی کوئی چیز کسی ایک فرد کو نہیں دے گا جس سے عام مسلمانوں کی ضروریات متعلق ہوں۔ جیسے نمک کی کانیں یا ایسے کنویں جن سے قرب و جوار کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہوں۔ [2]

یہاں نمک اور پانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں ضرورت کی اور چیزیں بھی آ سکتی ہیں۔ علامہ ابن ہبیرہ نے لکھا ہے کہ ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ نمک والی زمین یا جس چیز سے بھی عام مسلمانوں کی منفعت وابستہ ہے اس پر کسی مسلمان کا تنہا قبضہ کر لینا جائز نہیں ہے۔ [3]

ذاتی وسائلِ حیات میں بھی دوسروں کا حق ہے

قدرت کے خزانوں کو آدمی بعض اوقات اپنی ذاتی جدوجہد اور محنت سے بھی حاصل کرتا ہے۔ وہ اس کا مالک ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے اپنی ضرورت کے لیے کنواں کھدوایا، نہر نکالی یا حوض اور ٹینک میں پانی کا ذخیرہ جمع کیا۔ اس سلسلہ میں ہدایت یہ ہے کہ اس سے دوسرے حاجت مندوں کو محروم نہ رکھا جائے۔ ایک حدیث میں اس بات پر سخت وعید سنائی گئی ہے کہ آدمی کے پاس فاضل پانی ہو اور وہ ضرورت مندوں کو ان کے استعمال کی اجازت نہ دے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ترمذی، ابواب الاحکام، باب ما جاء فی القطائع۔ ابن ماجہ، ابواب الرہون، باب اقطاع الانہار والعیون

[2] ہدایہ : ۴/۴۷۸

[3] الافصاح عن معانی الصحاح : ۲/۵۱

نے تین قسم کے انسانوں کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ تو انھیں دیکھے گا، نہ ان سے بات کرے گا اور ان پر اس کا سخت عذاب ہوگا۔ ان میں سے ایک کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

رجل کان له فضل ماء بالطریق فمنعه من ابن السبیل[1]

ایک وہ شخص جس کے پاس راستہ میں (کنویں وغیرہ کی شکل میں) فاضل پانی تھا اور اس نے مسافر کو اس سے فائدہ اٹھانے سے روک دیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

فیقول اللہ الیوم امنعك کما منعت فضل ما لم تعمل یداك[2]

اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ آج میں تمھیں اپنے انعام سے اسی طرح محروم کر دوں گا جس طرح کہ تم نے ایک زائد چیز کو، جس کے پیدا کرنے میں تمھاری کوشش کا کوئی دخل نہیں تھا، دینے سے انکار کر دیا تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام اس بات کی کس قدر تاکید کرتا ہے کہ آدمی کو جو وسائلِ حیات حاصل ہیں ان سے اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد دوسروں کی ضروریات کا بھی خیال رکھے۔

---

[1] بخاری، کتاب المزارعہ، باب اثم من منع ابن السبیل من الماء۔ مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم اسبال الازار۔ الخ

[2] بخاری، کتاب المزارعۃ، باب من رای ان صاحب الحوض الخ آدمی کے پاس پانی کا ذخیرہ ہو تو اس کے لیے دوسروں کی حاجت کا پورا کرنا کس حد تک ضروری ہے، اس کی تھوڑی سی تفصیل کے لیے دیکھی جائے فتح الباری: ۵/۲۱

خدمت خلق کے ادارے اور تنظیمیں

اداروں کی ضرورت اور اہمیت

انسان اس دنیا میں بعض بنیادی ضروریات اور فطری تقاضے لے کر پیدا ہوتا ہے ان کے پورا کرنے میں اسے مختلف سطحوں پر خاندان، خیر خواہ افراد، رفاہی اداروں اور ریاست کا تعاون ملتا رہتا ہے۔ یہ تعاون بھرپور ہو تو اس کے وجود و بقا اور ترقی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، اس میں جس حد تک کمی ہو اس حد تک یہ امکانات کم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک فرد کے ذاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بسا اوقات افراد اور اداروں کے تعاون میں کوئی بڑا فرق نہیں محسوس ہوتا، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کا تعاون وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تعلیمی، معاشی اور طبی اداروں کی خدمات کو لیجیے۔ ایک طالب علم تعلیم سے فارغ ہو جائے تو اسکول اور کالج کا کام ختم ہو جاتا ہے، بے روزگار کو روزگار مل جائے تو معاشی اداروں کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے، مریض کو ممکنہ طبی سہولتیں فراہم کرنے کے بعد ہاسپٹل اور شفاخانے اپنے فرض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں یہی کام کسی شخص کا خاندان یا اس کا کوئی خیر خواہ انجام دیتا ہے۔ لیکن اس پہلو سے اداروں کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے کہ ان کی خدمات پوری آبادی اور اس کے مختلف طبقات کے لیے ہوتی ہیں۔ ان کے پیش نظر فردِ واحد کے مفاد کی جگہ پورے معاشرے کا مفاد ہوتا ہے کسی شخص کو تعلیم دے کر سوسائٹی میں باعزت مقام تک پہنچانا خاص اس شخص کی خدمت ہے، لیکن ایک اچھے اسکول کا چلانا جہاں بے شمار بچے علم و ہنر سے آراستہ ہو کر نکلیں ایک پوری نسل کی خدمت ہے۔

اسی طرح کسی بے روزگار کو روزگار پر لگا دینا ایک شخصی تعاون ہے لیکن کسی ایسے ادارے کا قیام جس سے بہت سے بے روزگاروں کا مسئلہ حل ہو ایک پورے طبقے کے ساتھ تعاون ہے۔ رفاہی ادارے کسی فرد کو نہیں بلکہ معاشرے کو بہ حیثیت مجموعی اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں دینی اور اصلاحی اداروں کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اہمیت ان خدمات سے کہیں زیادہ ہے جو مادی مقاصد کی تکمیل کے لیے انجام دی جاتی ہیں۔

رفاہی اداروں کے ذریعہ خدمتِ خلق کے کاموں کو مربوط اور منظم کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ان میں عدم توازن اور بے ترتیبی پیدا ہونے نہیں پاتی اور جو کوئی جس درجہ میں خدمت کا مستحق ہے اس کی خدمت ہوتی رہتی ہے۔ رفاہی ادارے آج کی دنیا میں فلاح وبہبود کی جو مفید اور وسیع خدمات انجام دے رہے ہیں انھیں ہر شخص دیکھ رہا ہے اور وقت ضرورت فائدہ بھی اٹھا رہا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں انسان کی ہر بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ادارے موجود ہیں۔ اس طرح کے اداروں کو قائم کرنا اور چلانا اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ ان سے اس کا ایک اہم مقصد پورا ہوتا ہے۔

منظم جدوجہد کے فوائد

ہر دور میں ایسے افراد پائے گئے ہیں جن کے ذریعہ رفاہی خدمات انجام پاتی رہی ہیں۔ ان میں سے بعض غیر معمولی خدمات بھی ہیں، ان سے نوع انسانی کو بڑا فائدہ پہنچا ہے، لیکن ایک تو اس طرح کے افراد کی تعداد کسی بھی دور میں کچھ زیادہ نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ فرد کے پاس قوت وصلاحیت کا تھوڑا سا سرمایہ ہوتا ہے۔ وسیع پیمانے پر خدمت خلق اور رفاہِ عام کے کام اس کی طاقت سے باہر ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بہت سے افراد مل جل کر اور منظم طریقہ سے کوشش کریں۔ تنظیم کی خوبی یہ ہے کہ اس کا انحصار کسی فرد پر نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک سے زیادہ افراد

کی صلاحیتوں اور ان کے وسائل کو استعمال کرتی ہے، اس لیے اس کی طاقت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے اور ایسے کام اس کے امکان میں ہوتے ہیں جو فردِ واحد کے دائرہ اختیار میں نہیں ہوتے۔ جس مقصد کے حصول کو فرد دشوار سمجھتا ہے تنظیم کے ذریعہ وہ مقصد بآسانی حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر خدمت خلق کی منظم جدوجہد کی جائے اور مل جل کر سماج کی فلاح و بہبود کے کام کیے جائیں تو ان کی افادیت کا دائرہ وسیع ہوگا اور جن کاموں کو اہمیت دینے کے باوجود کوئی ایک فرد انجام نہیں دے پاتا، وہ انجام پا سکیں گے۔ بڑے بڑے رفاہی اداروں کو قائم کرنے، انہیں باقی رکھنے اور سلیقہ سے چلانے میں ایک دو نہیں بہت سے افراد کی مسلسل اور انتھک جدوجہد کا دخل ہوتا ہے۔ اس کے بغیر وہ وجود میں نہیں آسکتے اور وجود میں آ بھی جائیں تو اپنے مقاصد پورے نہیں کر سکتے۔

اسلام نے زکوٰۃ کا نظام ریاستی سطح پر کیا ہے۔ اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ جو افراد نصاب کے مالک ہیں ان سے زکوٰۃ وصول کرے اور ان لوگوں کے درمیان تقسیم کرے جو اس کے مستحق ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام خدمت خلق کے لیے منظم جدوجہد کو پسند کرتا اور اس کی حوصلہ افزائی فرماتا ہے۔

غیر مسلموں سے تعاون

انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود کے کام میں غیر مسلم تنظیموں اور اداروں کے ساتھ تعاون میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید نے یہ اصولی تعلیم دی ہے۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ إِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ	نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے

الْعِقَابِ ○ (المائدہ: ۲) رہو۔ بے شک اللہ کی سزا بہت سخت ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں کوئی مضبوط سیاسی نظام نہیں تھا جس کی وجہ سے ایک طرح کا سیاسی وسماجی انتشار پایا جاتا تھا اور لوگوں کی جان و مال محفوظ نہ تھے۔ کمزور، طاقت والوں کی چیرہ دستی کا نشانہ بنتے رہتے۔ کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے اور ان سے باز پرس کرنے والا نہ تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر جنگ وجدال، خونریزی اور ظلم وزیادتی کا بازار گرم ہو جاتا۔ اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش مشکل ہی سے ہوتی۔ مکہ جیسے دارالامن اور مرکزی شہر کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ اس صورت حال کو بعض دردمند لوگوں نے بدلنا چاہا، مشورہ کے لیے عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے اور یہ فیصلہ کیا کہ ظلم وزیادتی کو ہر قیمت پر روکا جائے گا۔ کسی بھی شخص پر چاہے وہ مکہ کا رہنے والا ہو یا باہر سے آیا ہو، ظلم ہونے نہ دیا جائے گا۔ ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت کی جائے گی اور اسے اس کا حق دلوایا جائے گا اور ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کی جائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس معاہدہ میں شریک تھے۔ یہ معاہدہ آپؐ کی بعثت سے پہلے ہوا تھا۔ لیکن بعثت کے بعد بھی آپؐ نے اس کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

لقد شهدت فى دار	میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں
عبد الله ابن جدعان	ایک ایسے معاہدہ میں شریک ہوا کہ مجھے
حلفا ما احب ان	اس کے عوض سرخ اونٹ (عرب کی
لى به حمر النعم	سب سے بڑی دولت) مل جائیں تو بھی
ولو ادعى به فى الاسلام	پسند نہیں ہے۔ اگر اسلام کے آنے کے بعد
لاجبت [1]	بھی مجھے اس کی دعوت دی جائے تو
	میں اسے قبول کروں گا۔

---

[1] ابن سعد، طبقات: ۱/۱۲۹ - ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ: ۱/۱۴۴-۱۴۵

ظلم و ناانصافی کے خاتمہ، انسانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی خدمت کے لیے جو تنظیم کام کرتی ہے وہ معاشرہ کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ جو معاشرہ اس قیمتی سرمایہ سے خالی ہو وہ دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ اسلام اس کا محافظ بھی ہے اور اس کو ترقی بھی دینا چاہتا ہے۔

ریاست سے تعاون

خدمت خلق کا سب سے بڑا ادارہ ریاست ہے۔ افراد اور تنظیمیں ہزار طاقت ور سہی لیکن ان کی طاقت بہر حال محدود ہوتی ہے۔ ان کو اتنے وسائل و ذرائع حاصل نہیں ہوتے کہ ہر پہلو سے معاشرے کی خدمت کر سکیں اور اس کی تمام مشکلات کو حل کر دیں۔ ریاست غیر معمولی وسائل و ذرائع کی مالک ہوتی ہے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کر سکتی ہے۔ اس لیے ایک فلاحی ریاست کی یہ قانونی اور اخلاقی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے کہ پورے معاشرے کی تعمیر اس ڈھنگ سے کرے کہ کوئی بھی شخص ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے اور اسے وہ تمام سہولتیں اور مواقع حاصل ہوں جو اس کی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ اگر ریاست اپنی ذمہ داری کو محسوس نہ کرے تو اس کا وجود بے معنی ہے۔ لیکن ریاست اتنی بڑی ذمہ داری سے اسی وقت سبک دوش ہو سکتی ہے جبکہ افراد اس کے ساتھ تعاون کریں۔ محض ریاست کی کوشش سے معاشرہ غربت، افلاس، جہالت، بے روزگاری اور مرض جیسی مصیبتوں سے پاک نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد میں معاشرہ کو پستی سے نکالنے اور اوپر اٹھانے کا جذبہ پایا جائے۔ ریاست اور افراد کے اشتراک و تعاون ہی سے خدمت خلق کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ اس کے بغیر یہ کام ہمیشہ ادھورا اور ناقص ہی رہے گا۔

غلط تصوّرات کی اصلاح

خدمت خلق کے بارے میں بعض غلط تصورات بھی پائے جاتے ہیں اور اس معاملہ میں بے اعتدالیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں ان کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

انسان پر مختلف حقوق عائد ہوتے ہیں

کوئی بھی فرد معاشرہ میں بالکل الگ تھلگ زندگی نہیں گزارتا بلکہ بے شمار افراد سے اس کے روابط ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کی ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں اور کچھ کی ذمہ داریاں وہ اٹھاتا ہے۔ بعض افراد پر اس کے حقوق ہوتے ہیں اور بعض دوسرے افراد کے حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ان حقوق اور ذمہ داریوں کا دائرہ دور و نزدیک کے بہت سے افراد تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کے ادا کرنے میں بڑی بے اعتدالیاں ہوتی ہیں۔ اسلام نے ان کی اصلاح کی ہے۔

حقوق میں ایک فطری ترتیب ہے

کسی معاشرہ میں انسان پر جو حقوق اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان میں ایک فطری ترتیب ہے۔ ان میں سب سے پہلے تو خود اس کی ذات کا حق ہے، پھر ماں باپ، بیوی بچوں اور قرابت داروں کے حقوق ہیں۔ ان کے بعد ہی دوسروں کے حقوق آتے ہیں۔ اسلام نے اسی ترتیب سے حقوق

عائد کیے ہیں۔ انسان اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دے سکتا ہے، اسی طرح اس کے قرابت دار اپنے حق سے دست بردار بھی ہو سکتے ہیں اور کمی بھی کر سکتے ہیں لیکن ان پر دوسروں کو ترجیح دینا صحیح نہیں ہے۔ جن افراد کا حق مقدم ہے وہ مقدم ہی رہے گا۔ اسے آدمی مؤخر یا نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسلام نے حقوق کی جو ترتیب رکھی ہے اسے ایک حدیث کی روشنی میں آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

عن ابی ھریرۃؓ	حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ
عن النبی صلے اللہ	علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپؐ
علیہ وسلم خیر	نے فرمایا کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی
الصدقۃ ما کان	اپنی ضروریات سے بے نیاز ہونے کے
عن ظھر غنی	بعد کرے۔ پہلے ان لوگوں پر صدقہ کرو
وابدء بمن تعول[1]	جن کے اخراجات کے تم ذمہ دار ہو۔

حضرت ابوہریرہؓ ہی کی ایک اور روایت اسے بالکل کھول دیتی ہے فرماتے ہیں:

امر النبی صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
علیہ وسلم بالصدقۃ	(ایک مرتبہ) حکم دیا کہ صدقہ اور انفاق
فقال رجل یا رسول	کیا جائے۔ اس پر ایک شخص نے عرض
اللہ، عندی دینار	کیا کہ میرے پاس ایک دینار ہے آپؐ
قال تصدق بہ	نے فرمایا اسے اپنے اوپر صدقہ (خرچ)
علی نفسک قال	کرو۔ اس نے کہا میرے پاس ایک اور
عندی اخر قال	دینار ہے۔ آپؐ نے فرمایا اسے اپنے
تصدق بہ علی	بچہ پر خرچ کرو۔ اس نے کہا کہ میرے

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب لاصدقۃ الا عن ظھر غنی الخ تفصیل کے لیے دیکھیے فتح الباری : ۱۹۰/۳

ولدك قال عندى اخر قال تصدق به على زوجتك قال عندى اخر قال تصدق به على خادمك قال عندى اخر قال انت ابصر له

پاس ایک اور دینار ہے۔ آپؐ نے فرمایا اسے اپنی بیوی پر خرچ کرو۔ اس نے کہا میرے پاس ایک اور ہے۔ آپؐ نے فرمایا اسے اپنے خادم پر خرچ کرو۔ اس نے عرض کیا میرے پاس ایک اور بھی ہے آپؐ نے فرمایا تم خود زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو کہ اسے کہاں خرچ کرنا چاہیئے۔)

قرابت داروں کا حق مقدم ہے

آدمی بعض اوقات اپنے مخصوص مزاج یا ذاتی رنجش اور خاندانی مخاصمت کی وجہ سے قرابت داروں کا حق فراموش کر دیتا ہے۔ وہ اپنوں کے ساتھ تو ہمدردی اور حسنِ سلوک کا روادار نہیں ہوتا لیکن غیروں کے ساتھ قدم قدم پہ دل جوئی، محبت اور ایثار و سخاوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ خونی رشتہ داروں اور قرابت داروں سے غفلت اور بے توجہی برتتے ہوئے دنیا بھر کے رفاہی کاموں سے اس کی دل چسپی جاری رہتی ہے۔ یہ ایک غیر فطری طرزِ عمل ہے۔ اسلام نے اس سے منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیکی کے بہت سے کاموں میں انفاق کا حکم دیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ ثواب اہلِ خاندان اور متعلقین پر انفاق کا ہے۔ اس کی فضیلت حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو

---

[1] ابوداؤد: کتاب الزکوٰۃ، باب فی صلۃ الرحم۔ نسائی: کتاب الزکوٰۃ۔ باب الصدقۃ عن ظہر غنی

وسلم دینارا انفقته فی سبیل اللہ ودینار انفقته فی رقبة ودینار تصدقت به علی مسکین ودینار انفقته علی اهلك اعظمها اجراً الذی انفقته علی اهلك[1]	دینار تم نے اللہ کے راستے میں خرچ کیا اسی طرح جو دینار تم نے غلام کو آزاد کرنے میں صرف کیا یا جو دینار تم نے کسی مسکین پر خرچ کیا اور جو دینار تم نے اپنے بیوی بچوں پر خرچ کیا ان میں زیادہ اجر وثواب اس دینار کا ہے جو تم نے اپنے بیوی بچوں پر خرچ کیا۔

محتاجوں کے حقوق نظر انداز نہ ہوں

انسان کو اپنی ذات اور اپنے قریب کے افراد سے محبت ہوتی ہے اس لیے ان کے حقوق ذرا کم ہی ضائع ہوتے ہیں لیکن یہی محبت بسا اوقات وسیع دائرہ میں خدمت خلق کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ آدمی اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ جس طرح اس پر اس کی ذات اور اس کے قرابت داروں کا حق ہے اسی طرح معاشرہ کے مسکینوں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کا بھی حق ہے۔ اسے ان کی ضروریات کا احساس نہیں ہوتا، ان کی مشکلات سے ہمدردی نہیں ہوتی، وہ ان کے حقوق سے نگاہیں پھیر کر صرف اپنی ذات اور اپنے خاندان کو دیکھنے لگتا ہے اور ان کی خوشی اور راحت کے لیے بے شمار افراد کے حقوق پر شب خون مارتا اور انھیں نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ ظلم ہے اور پورے معاشرہ کے ساتھ بدخواہی ہے۔ معاشرہ کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ہر ایک کا حق ادا کرے اور کسی کے مفاد کو نقصان نہ پہنچائے۔ اسلام نے جہاں اس بات کی تاکید کی ہے کہ انسان اپنے اور اپنے متعلقین کے حقوق ادا کرے

---

[1] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی العیال والمملوک الخ

وہیں اس کا بھی حکم دیا ہے کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جس سے معاشرہ کے کسی بھی فرد کو کوئی نقصان پہنچے بلکہ ہر ایک کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے جدوجہد کرتا رہے۔ جس معاشرہ میں کمزور کے حقوق محفوظ نہ ہوں اسے تباہی سے ہمکنار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ان اللہ لا یقدس امۃ لا یؤخذ للضعیف فیہم حقہ[1]

بے شک اللہ اس قوم کو پاک اور بری نہیں قرار دے گا جس میں کمزور کو اس کا حق نہ دیا جائے۔

انسان اپنی ذات اور خاندان کی محبت میں کسی حد پر نہیں رکتا۔ وہ خود بھی عیش و عشرت کی زندگی گزارنا چاہتا ہے اور اپنے متعلقین کے لیے بھی عیش و تنعم کی زندگی فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں دوسرے مستحقین کو نقصان پہنچائے بغیر کامیاب ہونا دشوار ہے۔ اسلام کی رو سے انسان اپنی اور اپنے متعلقین کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس کے بعد معاشرہ کے دیگر افراد کے حقوق شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی حقیقت قرآن مجید کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ: ۲۱۹)

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ نیکی کی راہ میں کیا خرچ کریں؟ ان سے کہو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو وہ خرچ کرو۔

امورِ خیر میں جو مال خرچ کر دینا چاہیے اس کے لیے آیت میں 'عفو' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ مال جو اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات سے زیادہ ہو۔[2] اس سے آگے

---

[1] مشکوٰۃ، 'کتاب البیوع' فی العطایا والھدایا بحوالہ شرح السنۃ

[2] 'عفو' کی تشریح میں متعدد اقوال ملتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے 'مایفضل عن اھلک' (جو تمہارے اہل و عیال کی ضروریات سے بچ جائے)۔ یہی تفسیر دیگر صحابہؓ و تابعینؒ سے بھی منقول ہے اس کی تائید مرفوع احادیث سے بھی ہوتی ہے ملاحظہ ہو ابن کثیر: تفسیر ۱/۲۵۶

ضروریات کی تعیین نہیں کی گئی ہے اس لیے کہ یہ افراد اور حالات کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔ آدمی خود ہی اس بات کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ کون سی چیز اس کی ضروریات میں شامل ہے اور کون سی نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی غلط نہیں ہے کہ آدمی اپنی اور متعلقین کی آسائش اور راحت کا خیال رکھے اور ان کے مستقبل کی فکر کرے، البتہ اسلام اس بات کا روادار نہیں ہے کہ آدمی اپنی آسودگی اور خوش حالی کی دھن میں معاشرہ کے مصیبت زدوں اور فاقہ کشوں کو فراموش کر بیٹھے۔

اس میں شک نہیں کہ انسان پر سب سے پہلے اپنے قریب ترین افراد کے حقوق عائد ہوتے ہیں لیکن ان حقوق کو ادا کر کے وہ ان ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہوسکتا جو معاشرہ کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اس پر آتی ہیں۔ کسی معاشرہ کا بہترین فرد وہی ہے جو ان دونوں قسم کی ذمہ داریوں کو ہر دم سامنے رکھے اور انھیں پورا کرنے کی کوشش کرے۔ اسلام اسی کے لیے تیار کرتا ہے۔

امیر و غریب کی مستقل تقسیم نہیں ہے

اسلام کمزوروں، ناداروں اور معاشرے کے محروم افراد کی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا بڑی تاکید کے ساتھ حکم دیتا ہے لیکن راہبانہ مذاہب یا بعض غیر معتدل معاشی نظریات کی طرح وہ سماج کو دو مستقل طبقات میں تقسیم نہیں کرتا کہ ایک طبقہ تو معاشی لحاظ سے مستحکم ہو اور اسے ہر طرح کی سہولتیں حاصل ہوں اور دوسرا طبقہ اپنی بنیادی ضرورتوں کے لیے بھی اس کا مستقل محتاج اور دست نگر رہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد معاشی طور پر خود کفیل ہو، اسے دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے، اس کے لیے وہ جدوجہد اور محنت کرے اور اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات کی تکمیل کے لیے جائز حدود میں کوشش کرے۔ یہ سب چیزیں اس کے نزدیک اجر و ثواب کی موجب ہیں۔ اس کے ساتھ معاشرے کے جو افراد صاحب حیثیت ہیں، جن کے پاس ضرورت سے زیادہ مال ہے اور جو

دوسروں کی مدد کر سکتے ہیں انھیں وہ حکم دیتا ہے کہ کم زوروں کی مدد کریں، ان کے دکھ درد میں کام آئیں اور انھیں معاشی لحاظ سے مستحکم ہونے میں مدد دیں۔ اس سلسلہ میں وہ ریاست کو بھی اس بات کا پابند بناتا ہے کہ جو افراد معاشی لحاظ سے کم زور ہوں ان کا تعاون کرے اور جو معاشی جدوجہد بالکل نہیں کر سکتے، ان کی کفالت کرے اور ان کی ضروریات کا بوجھ اٹھائے۔ یہ دراصل اس کے نزدیک معاشرے کو اوپر اٹھانے اور خود کفیل بنانے کی تدبیر ہے۔

اسے آپ اس حقیقت سے سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام نے زکوٰۃ کی حسب ذیل مدات بیان کی ہیں:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (التوبہ: ۶۰)	صدقات تو ہیں صرف محتاجوں اور مسکینوں اور ان کارکنوں کے لیے جو زکوٰۃ وصول کرنے پر متعین ہیں اور ان لوگوں کے لیے جن کی دل جوئی کرنا مقصود ہے اور غلاموں کو آزاد ہونے میں مدد دینے کے لیے اور قرض داروں کا قرض ادا کرنے کے لیے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور مسافروں کے لیے۔ یہ حکم اللہ کی طرف سے مقرر ہے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔

معاشرہ میں جو افراد صاحب حیثیت اور متعین نصاب کے مالک ہیں، اسلام نے انھیں زکوٰۃ نکالنے اور ان متعین مدات میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے لیکن اس نے ایسا کوئی نظم نہیں قائم کیا ہے کہ یہ کل مدات لازماً باقی رہیں اور مستحقین کا ایک گروہ دوسروں کی مدد سے پرورش پاتا رہے۔ ایک طبقہ زکوٰۃ دینے والا اور ایک طبقہ زکوٰۃ لینے والا معاشرہ میں برقرار رہے۔

اسلامی معاشرہ میں اس بات کا امکان ہے اور ایسا عملاً ہوتا رہا ہے کہ ان میں سے بعض مدات موجود نہ ہوں اور صرف بعض مدات رہ جائیں اور انھیں میں زکوٰۃ تقسیم کرنی پڑے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر یہ سب مدات موجود ہوں تو کیا ان سب میں زکوٰۃ کی تقسیم ضروری ہے۔ امام ابو حنیفہؒ امام مالکؒ اور جمہور علماء کے نزدیک اسلامی ریاست کو حق ہے کہ وہ ضرورت سمجھے تو ان میں سے بعض مدات میں خرچ کرے اور بعض میں نہ کرے۔ البتہ امام شافعیؒ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک ریاست کو ان کل مدات میں زکوٰۃ تقسیم کرنی چاہیئے۔ علامہ ابن رشد دونوں رایوں کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ آیت کے الفاظ تو اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ زکوٰۃ ان سب مدات میں خرچ ہو لیکن ان کا منشاء یہ ہے کہ اہل حاجت کو ترجیح دی جائے اور ان کی ضروریات پوری ہوں۔ آیت میں جن مدات کا ذکر ہے ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان مدات میں زکوٰۃ خرچ ہونی چاہیئے، یہ نہیں ہے کہ لازماً ان سب میں خرچ کی جائے[1]

یہ تو ریاست کا معاملہ ہوا۔ فرد کو بھی اس کا اختیار ہے کہ وہ اپنی کل زکوٰۃ کو کسی ایک مد میں جسے وہ اہم سمجھے خرچ کرے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ایک ہزار درہم کا مقروض ہے۔ اسے وہ ادا نہیں کر پا رہا ہے۔ اگر کسی کی زکوٰۃ کی رقم ایک ہزار درہم ہی نکلتی ہو، اور وہ اپنی ساری رقم اسے دے دے تا کہ وہ اپنا قرض ادا کر سکے تو یہ جائز ہے۔ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں یہی جمہور کا مسلک ہے[2]

اسی طرح ہر جگہ کی زکوٰۃ اسی جگہ صرف ہونی چاہیئے لیکن فقہ حنفی میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی کے رشتہ دار دوسری جگہ ہوں یا وہاں کے لوگ زیادہ محتاج ہوں تو زکوٰۃ منتقل کی جا سکتی ہے تا کہ وہاں کی ضرورت پوری ہو[3]

---

[1] بدایۃ المجتہد ۱/۲۶۶ نیز ملاحظہ ہو مؤطا کتاب الزکوٰۃ، باب اخذ الصدقۃ وما یجوز لہ اخذھا مع شرح الزرقانی: ۲/۶۴

[2] فتاوی ابن تیمیہ، طبع جدید ۲۵/۲،

[3] ہدایہ: ۱/۱۸۸

اس کی بعض تفصیلات میں علمار کے درمیان اختلاف ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر کسی جگہ حاجت نہ ہو تو جہاں حاجت ہو وہاں زکوٰۃ کی رقم صرف کی جا سکتی ہے[1]

اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کے ذریعہ صدقات وخیرات پر پلنے والا کوئی گروہ نہیں تیار کیا ہے بلکہ جو افراد معاشی لحاظ سے کم زور ہیں اور جن کی معاش کا کوئی نظم نہیں ہے، اس سے ان کی معاش کا بندوبست کیا ہے۔

شخصی اور سماجی ضروریات کے لیے مدد طلب کی جا سکتی ہے

اسلام نے دوسروں کے سامنے اپنی ضروریات کے رکھنے اور دست سوال دراز کرنے سے منع فرمایا ہے لیکن بعض نازک حالات میں احتیاج کو بیان کرنے اور مدد طلب کرنے کی بھی اجازت دی ہے۔ حضرت قَبِیصہ بن مخارقؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے اوپر ایک مالی ذمہ داری لی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے مدد کی درخواست کی آپؐ نے فرمایا: یہیں مدینے میں قیام کرو، صدقہ کا مال آئے گا تو تمھاری ضرورت پوری کر دی جائے گی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

یا قبیصۃ ان المسألۃ	اے قبیصہ سوال جائز نہیں سوائے
لا تحل الا لاحد ثلاثۃٍ	اس شخص کے جو ان تین میں سے ایک ہو،
رجل تحمل حمالۃً	وہ شخص جس نے دوسروں کی خاطر اپنے اوپر
حلت له المسألۃ	قرض کا بوجھ اٹھایا ہو۔ قرض کی رقم فراہم
حتی یصیبھا ثم	ہونے تک وہ سوال کر سکتا ہے پھر اسے رک
یمسك و رجل	جانا چاہیئے۔ دوسرا وہ شخص جس کا مال کسی
اصابته جائحۃ	حادثہ میں ختم ہو جائے اس کے لیے بھی

---

[1] ابن ہبیرہ، الافصاح: ۱/۲۲۸

احتاجت مالہ حتی	سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کی
یصیب قواماً من عیش	حالت ٹھیک ہوجائے اور وہ کھڑا ہو جائے
او قال سداداً من عیش	یا آپ نے یہ فرمایا کہ یہاں تک کہ اس کی
ورجل اصابتہ فاقۃ	ضرورت پوری ہو جائے۔ تیسرا وہ شخص جسے
حتی یقوم ثلاثۃ من ذوی	فاقہ لاحق ہو اور اس کی قوم کے تین آدمی
الحجیٰ من قومہ لقد	یقین کے ساتھ کہیں کہ فلاں شخص فاقہ میں
اصابت فلاناً فاقۃٌ فحلت	مبتلا ہے اس کے لیے بھی سوال جائز ہے
لہ المسئلۃ حتی یصیب قواماً	یہاں تک کہ اس کی حالت ٹھیک ہو جائے
من عیش او سداداً من	یا یہ فرمایا کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے
عیش فما سواھن من	ان تین صورتوں کے علاوہ اے قبیصہ!
المسئلۃ یا قبیصۃ سحتاً	سوال کی جتنی صورتیں ہیں سب حرام ہیں۔
یاکلھا صاحبہا سحتاً[1]	ان کے ذریعہ کھانے والا حرام کھاتا ہے۔

اس میں تین قسم کے آدمیوں کو سوال کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ایک وہ شخص جو لوگوں کے جھگڑوں اور نزاعات کو ختم کرنے اور متحارب گروہوں کے درمیان صلح صفائی کے لیے اپنے اوپر کوئی مالی ذمہ داری لے لے۔ یہ ذمہ داری وہ خود نہ ادا کر سکے تو دوسروں سے مدد لے سکتا ہے۔ یہ اس پر ایک قرض ہے اور اس قرض کے ادا کرنے میں معاشرہ کو مدد کرنی چاہیے۔[2]

افراد ہوں یا ادارے اور سوسائٹیاں آپس کے اختلافات ان کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ایک فریق ظلم کرتا ہے دوسرا اس کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ ایک اپنے حق سے زیادہ مطالبہ کرتا ہے دوسرا اس کے حق ہی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں

---

[1] مسلم، کتاب الزکوٰۃ باب من تحل لہ المسئلہ۔

[2] اس کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو معالم السنن: ۲/۶۷، ۶۸

ہوتا یا اسے اس کے حق سے کم دینا چاہتا ہے۔ یہ اختلافات جب حد سے آگے بڑھتے ہیں تو جان و مال کے بڑے نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ ان جھگڑوں کو بسا اوقات مالی تعاون کے ذریعہ ختم کیا جا سکتا ہے اور صلح صفائی ہو سکتی ہے۔ دو لڑنے والے افراد یا فریقوں کے درمیان صلح کی خاطر مالی بوجھ برداشت کرنا خدمتِ خلق کی بہترین شکل ہے۔ یہ حدیث کہتی ہے کہ جو شخص اس خدمت کے لیے اٹھے، وہ اس تعاون کے لیے دوسروں کے سامنے دستِ سوال بھی دراز کر سکتا ہے۔ حکومت اور معاشرے کو اس میں اس کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

دوسرا شخص جس کو سوال کرنے کی اس حدیث میں اجازت دی گئی ہے وہ ہے جو کسی ارضی و سماوی مصیبت کی وجہ سے معاشی مشکلات میں گرفتار ہو جائے۔ بعض اوقات سیلاب، طوفان، زلزلہ، آتش اور لوٹ مار جیسی آفات سے ایک خوش حال آدمی بھی اچانک اپنی بنیادی ضروریات تک پوری کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس صورت میں اسے اجازت دی گئی ہے کہ وہ دوسروں سے مدد طلب کرے اور اپنی ضروریات پوری کرے۔

امام خطابی کہتے ہیں کہ کسی کا ساز و سامان سیلاب میں غرق ہو جائے یا آگ سے جل جائے یا اس کے غلّے اور پھلوں کو پالا لگ جائے یا اس طرح کی کسی دوسری آفت میں گرفتار ہو جائے تو اس کے لیے سوال کرنا جائز ہے اور واجب ہے کہ لوگ اُسے صدقہ و خیرات دیں۔ اس شخص سے دلیل کا مطالبہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی تباہی خود اس کے احتیاج کی دلیل ہے[1]

راوی حدیث کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'حتیٰ یصیب قواما من عیش' ارشاد فرمایا، یا 'سدادا من عیش' کے الفاظ استعمال فرمائے لیکن

---

[1] معالم السنن: ۲/۶۷

دونوں جملے ہم معنی ہیں[1] ان کا مطلب یہ ہے کہ اتنا سروسامان ہو جائے کہ آدمی کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو جائیں اور وہ بے نیاز ہو جائے۔ انسان کی زندگی کا دارومدار جن امور پر ہوتا ہے انھیں 'قواماً من عیش' کہا گیا ہے۔ غربت کی وجہ سے زندگی میں جو رخنہ اور خلل پیدا ہو جاتا ہے ان کے پُر کرنے کو 'سداداً من عیش' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک انسان کا یہ فطری حق ہے کہ اس کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں۔ اس کے لیے وہ مجبوری میں دوسروں سے مانگنے کی بھی اجازت دیتا ہے۔

حدیث میں جس ناگہانی صورت کا ذکر کیا گیا ہے وہ کسی بھی شخص کے ساتھ کسی بھی وقت پیش آسکتی ہے۔ جو شخص اس صورت حال سے دوچار ہو کم از کم اس کی بنیادی ضرورتوں کے پورا کرنے کی ضرور کوشش ہونی چاہیے۔ یہ کوشش افراد کی طرف سے بھی ہونی چاہیے اور اداروں کی طرف سے بھی۔ اگر انسان کی ناگزیر ضرورتیں بھی پوری نہ ہوں تو اس کے لیے اپنے نقصان کی تلافی کرنے اور اپنی سابقہ حالت کو بحال کرنے کی کوئی تدبیر کرنا آسان نہیں ہے۔ مزید ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے بارے میں تو اس کا ذہن شاید سوچنے کے لیے بھی آمادہ نہ ہوگا۔

تیسرا شخص جسے سوال کرنے کی اجازت دی گئی ہے وہ ہے جو فقر و فاقہ پر مجبور ہو گیا ہو۔ اور اس کی مجبوری کی گواہی اس کے خاندان، محلہ اور بستی کے لوگ دیں۔ فقر و فاقہ کے اسباب، بے روزگاری، کم آمدنی، صحت کی خرابی وغیرہ بہت سے ہو سکتے ہیں۔

---

[1] امام نووی فرماتے ہیں۔ السداد والقوام وهما بمعنى وهو ما يغني من شئ وما تسد به الحاجة۔ شرح مسلم ۱/۳۳۲ علامہ ابن اثیر نے 'قواماً من عیش' کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔ ای ما یقوم بحاجة الضروریة۔ قوام الشئ عماده الذی یقوم به۔ النہایہ فی غریب الحدیث ۴/۲۸۵ 'سداداً من عیش' کی شرح میں فرماتے ہیں ای ما یکفی حاجة والسداد کل شیئ سددت به خللا ۲/۱۵۳

ان میں سے کسی بھی وجہ سے آدمی بھوک اور فاقہ کی لپیٹ میں آگیا ہے تو اسے دوسروں سے مانگنے کا حق ہے اور ان کا اخلاقی اور بعض حالات میں قانونی فرض ہے کہ اس کی مدد کریں اور اسے موت کے منہ میں جانے نہ دیں لیکن ظاہر ہے جن اسباب کی وجہ سے وہ اس حالت میں ہے ان اسباب کا دور کرنا زیادہ اہم ہے، ورنہ جب تک یہ اسباب ختم نہ ہوں وہ مدد کے لیے ہاتھ پھیلاتا رہے گا اور اس کا احتیاج ختم نہ ہوگا۔ اسلام کسی کو اس حال میں دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس سلسلہ میں ان احادیث کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو سوال کی مذمت میں آئی ہیں[1]

حدیث میں اس شخص کو بھی سوال کی اجازت دی گئی ہے جو قرض کی وجہ سے سخت پریشانی میں مبتلا ہو۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان المسألة	سوال صرف تین طرح کے آدمیوں کے
لا تصح الا لثلاث	لیے جائز ہے۔ ایک وہ جسے فقر واحتیاج
لذی فقر	نے بالکل لٹا دیا ہو، دوسرا وہ جس پر قرض
مدقع اولذی	کا شدید بوجھ ہو، تیسرا وہ جس نے کسی کا
غرم مفظع	خون بہایا ہو اور اس کی دیت کا مسئلہ اسے بیا

---

[1] جو شخص کسی ارضی وسماوی مصیبت میں گرفتار ہو جائے اس کے لیے حدیث میں گواہی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کیوں کہ اس کا نقصان بالکل واضح ہے۔ یہ خود اس کے غربت و افلاس کی دلیل ہے۔ لیکن اگر ایک خوش حال اور کھاتا پیتا شخص اپنے فقر وفاقہ اور افلاس کا اظہار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس کا مال واسباب راتوں رات چوروں نے لوٹ لیا ہے یا اس کی امانت کسی نے ہڑپ کرلی ہے یا کسی ناگہانی مصیبت کی وجہ سے وہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہو گیا ہے تو ضروری ہوگا کہ اس کے قریب کے تین سوجھ بوجھ والے اشخاص اس کی تصدیق کریں۔ اس کی نوعیت شہادت کی نہیں ہے ورنہ دو کی شہادت کافی ہوتی بلکہ یہ دراصل تحقیق حال اور تصدیق کی ایک صورت ہے۔ ملاحظہ ہو معالم السنن: ۲/۶۷ یہ بات آپ نے غالباً سوال سے باز رکھنے کے لیے بھی فرمائی ہے تاکہ کوئی بھی شخص فاقہ کے نام پر سائل نہ بن جائے۔ یہ سوال پر ایک طرح کی بندش ہے۔

ادلدم موجع [1] اس کے سرپرستوں کو پریشان کر رہا ہو۔

آدمی کبھی قرض میں اس بری طرح پھنس جاتا ہے کہ اس سے نکلنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اس سے بسا اوقات آدمی کا سارا کاروبار ختم ہو جاتا ہے اور اس کے پاس کوئی ذریعہ معاش باقی نہیں رہتا۔ قرض کی وجہ سے چلتے ہوئے ادارے بند ہو جاتے ہیں اور بڑی بڑی کمپنیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ موجودہ دور میں اس طرح کے افراد اور اداروں کے ساتھ دو طرح کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ ان کے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر کے ان کا کاروبار ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس بے رحمی کے نتیجہ میں خوش حال زندگی گزارنے والے خاندان کے خاندان غربت و افلاس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور ان کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے۔

دوسرا رویہ جو ہمدردی کا رویہ سمجھا جاتا ہے یہ ہے کہ اس مصیبت سے نکلنے اور ان کی معیشت کو سنبھالا دینے کے لیے انھیں مزید قرض دیا جائے۔ لیکن آج قرض کے ساتھ سود لازمی ہے۔ یہ بظاہر ہمدردی بھی انسان کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی ایک مکروہ شکل ہے۔ اس سے آدمی قرض در قرض اور سود در سود کے جال میں اس طرح پھنستا چلا جاتا ہے کہ اس سے کبھی نکل نہیں پاتا۔ اس سے نجات پانے کے لیے بعض اوقات وہ خود چاہنے لگتا ہے کہ اس کے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا جائے اور اس کے کارخانوں اور فیکٹریوں پر تالے لگا دیے جائیں۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر کسی نے جائز مقصد اور جائز ذریعہ سے قرض حاصل کیا ہے اور اس قرض کے ڈوبنے میں دانستہ اس کی کسی غلطی کا دخل نہیں ہے تو معاشرہ کا فرض ہے کہ اس پریشانی سے نکلنے میں اس کی مدد کرے اس کے لیے وہ معاشرہ اور ریاست سے اپیل بھی کر سکتا ہے۔ زکوٰۃ میں بھی اس کے لیے ایک مد رکھی گئی ہے۔ جو شخص بھی ان دونوں رویوں کا مقابلہ کرے گا وہ

---

[1] ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب ماتجوز فیہ المسئلۃ۔ اس مفہوم کی روایتیں ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں بھی ہیں۔

یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ اسلام کا رویہ ہمدردی اور انسانیت کا ہے جب کہ موجودہ دور نے بے رحمی اور ظلم کا رویہ اختیار کیا ہے۔

خدمتِ خلق کل دین نہیں ہے

اسلام کی بنیاد عقائد کے بعد اعمال صالحہ پر ہے لیکن تمام اعمال صالحہ ایک ہی درجہ اور ایک ہی حیثیت کے نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اور بعض کی اہمیت نسبتاً کم ہے۔ بعض ارکانِ دین ہیں بعض ضروری اور بعض پسندیدہ سمجھے گئے ہیں، بعض کو صرف جواز کا درجہ حاصل ہے۔ فقہ کی زبان میں اس فرق کو فرض، واجب، مندوب، مستحب اور مباح جیسی اصطلاحات میں بیان کیا جاتا ہے۔ اپنی اہمیت کے لحاظ سے اعمال کی جو ترتیب شریعت نے قائم کردی ہے اس کی پابندی بہت ضروری ہے، ورنہ پورا نظامِ شریعت درہم برہم ہو جائے گا۔

خدمتِ خلق کو اس میں شک نہیں شریعت نے بڑی اہمیت دی ہے لیکن یہی کل دین یا اس کا حاصل نہیں ہے۔ بعض بزرگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خدمت ہی ان کا دین اور مذہب تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے خدمتِ خلق کی اہمیت بیان کرنا مقصود ہو، لیکن اس میں مبالغہ ضرور پایا جاتا ہے۔ اس سے دین کے دوسرے زیادہ اہم تقاضوں کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے یا ان کی طرف وہ توجہ نہیں ہو پاتی جو ہونی چاہیئے اور خود ان بزرگوں کی زندگی کے کچھ اور نمایاں پہلو دب جاتے ہیں۔ اس طرح کا غیر متوازن رویہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں نے بھی اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک خدمت ہی مذہب کی روح اور اس کی اصل غرض وغایت ہے۔ مشرکین مکہ میں بھی کچھ اسی طرح کا احساس پایا جاتا تھا۔ وہ کعبۃ اللہ کی دیکھ بھال کرتے تھے، حاجیوں کے لیے پانی کا نظم کرنے اور ان کی خدمت

کو کارِ ثواب سمجھتے تھے۔ انھیں ان خدمات پر بڑا ناز تھا اور اس کی وجہ سے وہ خود کو کعبۃ اللہ کی تولیت کا حق دار تصور کرتے تھے۔ اسلام کسی بھی معاملہ میں بے اعتدالی اور عدم توازن کو راہ پانے نہیں دیتا اور بساطِ زندگی میں جس عمل کی جو جگہ ہے اسے ٹھیک اسی جگہ رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے مشرکین سے کہا کہ تمھاری یہ خدمات اللہ اور آخرت پر ایمان، نماز اور زکوٰۃ، دل کا خدا کے خوف کے علاوہ ہر خوف سے پاک ہونا، اس کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد، اس راہ میں جان ومال کی قربانی، ہجرت اور جہاد جیسے بلند وبرتر اعمال کا مقابلہ ہرگز نہیں کرسکتیں۔ یہ خصوصیات جن میں ہیں وہی کعبۃ اللہ کے متولی ہوں گے۔ تم اس کے حق دار نہیں ہوسکتے۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا	اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، جو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور سوائے اللہ کے کسی سے نہ ڈریں، ان ہی سے یہ توقع ہے کہ وہ ہدایت پائیں گے۔ کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجدِ حرام کی آبادکاری کو اس شخص کے عمل کے برابر ٹھہرالیا ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھے اور اللہ کے راستے میں جہاد کرے۔ یہ دونوں اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہوسکتے۔ اللہ فاسقوں کی ہدایت نہیں کرتا۔ اللہ کے ہاں ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے،

وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ۙ ○ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ○ (التوبہ: ۱۸-۲۲)

جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا۔ یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ انھیں ان کا رب اپنی طرف سے بڑی رحمت اور بڑی رضامندی اور ایسی جنتوں کی خوش خبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ کی نعمتیں ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک اللہ کے نزدیک بڑا اجر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کے بہت سے تقاضے ہیں۔ ان میں سے ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود کی جدوجہد کی جائے۔ لیکن اسے انجام دے کر کوئی شخص دین کے دوسرے تقاضوں سے سبک دوش نہیں ہو جاتا۔ دین اس سے جس وقت جس تقاضے کو پورا کرنے کا مطالبہ کرے اسے پورا کرنا ہوگا۔
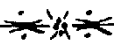
اخلاص ضروری ہے

کسی بھی عمل کے لیے محرک کا سوال بہت اہم ہے۔ ایک ہی عمل کے پیچھے اچھے محرکات بھی ہو سکتے ہیں اور غلط محرکات کے تحت بھی وہ انجام پا سکتا ہے۔ اسلام نے عمل کے محرک کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ اس کے نزدیک کسی عمل کا جائز اور درست ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے محرک کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔ صحیح محرک کو وہ 'اخلاص' سے تعبیر کرتا ہے اور غلط محرک کے لیے اس کے نزدیک ایک جامع لفظ 'ریا' ہے۔

خدمت اخلاص کے ساتھ ہو

خدمتِ خلق بہت بڑا کارِ خیر اور خدائے تعالیٰ سے قربت کا ذریعہ ہے۔ اس پر جس اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا مستحق انسان اسی وقت ہوگا جب کہ وہ پورے اخلاص کے ساتھ اسے انجام دے اور خدا کی رضا کے سوا کوئی دوسری غرض اس کے سامنے نہ ہو۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو انفاق کے ذیل میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ روپیہ پیسہ اور مال کا خرچ کرنا انفاق ہے۔ خدمتِ خلق کے کاموں میں قدم قدم پر اس کی ضرورت پیش آتی ہے۔ خدمت خلق کی راہ میں مال کا خرچ کرنا جس قدر دشوار ہے، اس میں اخلاص کا باقی رکھنا اس سے زیادہ دشوار ہے۔ اللہ کے جو بندے اخلاص کے ساتھ اپنی دولت خرچ کرتے ہیں، قرآن مجید میں ان کی توصیف کی گئی اور انہیں آخرت کی کامرانی کی بشارت دی

گئی ہے۔ ارشاد ہے :

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝ (اللیل: ۱۷-۲۱)	اور جہنم سے اس شخص کو دور رکھا جائے گا جو خدا سے بہت ڈرنے والا ہے، جو اپنا مال اپنے نفس کے تزکیہ کے لیے خرچ کرتا ہے۔ اس پر کسی کا احسان نہیں ہے کہ وہ اس کا بدلہ دے۔ وہ تو صرف اپنے ربِ اعلیٰ کی رضا چاہتا ہے اور بہت جلد وہ راضی ہو جائے گا۔

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات حضرت ابوبکرؓ کے سلسلہ میں نازل ہوئیں۔ مکہ کے ابتدائی دور میں اسلام قبول کرنے والوں، خاص طور پر غلاموں پر ناقابل برداشت زیادتیاں ہوتی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ ان غلاموں کو خرید کر آزاد فرما دیتے تھے۔ ان میں حضرت بلالؓ بھی تھے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ بلالؓ نے حضرت ابوبکرؓ پر کوئی احسان کیا ہو اور وہ ان کا بدلہ چکا رہے ہوں۔ ان آیات میں اس کی تردید اور حضرت ابوبکرؓ کے اخلاص کی تعریف کی گئی ہے۔[1]

حضرت ابوبکرؓ کے اس انفاق کو اسلام کی خدمت بھی کہا جا سکتا ہے اور اسے انسانوں کی خدمت کہنا بھی غلط نہ ہوگا، لیکن اس خدمت کو خدائے تعالیٰ کی خوشنودی کی سند اس وقت ملی جب کہ اس کے پیچھے صرف اس کی رضا کا جذبہ موجود اور کارفرما تھا اور کسی بھی دوسرے محرک سے وہ پاک تھا۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ان آیات میں جو اوصاف بیان ہوئے ہیں، وہ حضرت ابوبکرؓ کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھے اور انھیں اس راہ میں سبقت کا شرف بھی حاصل ہے لیکن آیات کے الفاظ عام ہیں اور پوری امت کے لیے ہیں۔[2] یعنی اس میں

---

[1] تفسیر بغوی اور خازن: ۷/۲۱۳-۲۱۴

[2] تفسیر ابن کثیر: ۴/۵۲۱

امت کا ہر وہ فرد آجائے گا جس میں یہ اوصاف پائے جائیں۔

اخلاص سے انفاق کا اجر و ثواب

اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے انفاق کا اجر و ثواب ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ٥ (البقرہ: ۲۶۵)

ان لوگوں کی مثال جو اپنا مال اللہ کی رضا کے طلب میں اور اپنے آپ کو اس پر جمائے رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسی بلندی پر کوئی باغ ہو اور اس پر تیز بارش نہ بھی ہو تو ہلکی پھوار ہی کافی ہے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔

یہاں اللہ کی رضا کی طلب کے ساتھ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اس کے کئی ایک مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انفاق پر طبیعت کو جمائے رکھتے ہیں یہاں تک کہ یہ جذبہ ان کے اندر رچ بس جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اخلاص کو پوری طرح باقی اور اسے ہر کھوٹ سے پاک رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی کمی آنے نہیں دیتے تیسرے یہ کہ انہیں آخرت اور وہاں کے عذاب و ثواب پر پورا الیقین ہوتا ہے اور وہ عذاب سے بچنے اور ثواب حاصل کرنے کے لیے اپنا مال لٹاتے رہتے ہیں[1]۔

انفاق برملا اور سب کے سامنے کرنے کی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے تاکہ دوسروں کو ترغیب ہو اور کارِ خیر میں وہ بھی آگے بڑھیں۔ وہ پوشیدہ طریقے سے اور چھپا کر بھی کیا جاسکتا ہے تاکہ لینے والے کی خودی مجروح نہ ہو اور وہ خفت نہ محسوس کرے۔ موقع و محل کے لحاظ سے دونوں صحیح ہیں لیکن دونوں میں اخلاص شرط ہے۔ ارشاد ہے:

---

[1] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو رازی تفسیر کبیر: ۲/۳۵۳

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (البقرہ: ۲۷۱)	اگر تم اپنے صدقات کو علانیہ دو تو بھی اچھی بات ہے اور اگر تم ان کو پوشیدہ رکھو اور فقراء پر خرچ کرو تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔ اللہ تمھارے گناہوں کو معاف فرمائے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔

پوشیدہ طریقہ سے انفاق میں ریاکاری کا امکان کم ہوتا ہے اس لیے اسے زیادہ بہتر کہا گیا ہے۔ جب تک کسی دینی و ملی مصلحت کا تقاضا نہ ہو انفاق خفیہ طریقہ ہی سے ہونا چاہیے۔ احادیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

سبعة يظلهم الله تعالٰى في ظله يوم لا ظل الا ظله۔	سات قسم کے انسان ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سایہ میں جگہ دے گا جبکہ اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔

ان سات قسم کے خوش بخت انسانوں میں آپؐ نے فرمایا:

ورجل تصدق بصدقة فاخفاها حتى لا تعلم شماله ما تنفق يمينه [1]	ایک وہ شخص بھی ہے جس نے صدقہ کیا اور اسے اس طرح پوشیدہ رکھا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو اس کا پتہ نہ چلا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔

ریا سے اجر و ثواب ضائع ہو جاتا ہے

"ریا" اخلاص کے لیے سم قاتل ہے۔ جہاں ریا موجود ہو وہاں اخلاص ختم

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الصدقۃ بالیمین۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل اخفاء الصدقۃ۔

ہوجاتا ہے۔ اخلاص سے قیامت کے روز اعمال خیر نتیجہ خیز ہوں گے اور ریاکاری انہیں بے ثمر بنا دے گی۔ اخلاص خدائے تعالیٰ کی نوازش بے پایاں کا موجب ہوگا، اور ریاکاری اس کے غضب کو دعوت دے گی۔ اس لیے قرآن و حدیث میں اخلاص پر جتنا زور دیا گیا ہے اسی قدر ریا، سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ریاکاری سے کس طرح اعمال بے نتیجہ ہو جاتے اور اپنا اجر و ثواب کھو بیٹھتے ہیں۔ قرآن مجید نے اسے یوں سمجھایا ہے۔

.... کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ۝ (البقرہ: ۲۶۴)

.....اس شخص کی طرح جو اپنا مال ریاکاری کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بڑی چٹان جس پر مٹی جمع ہو جائے اس پر تیز بارش ہو اور وہ اسے صاف پتھر چھوڑ دے اس طرح وہ جو کچھ کمائیں گے وہ ان کے ہاتھ نہیں آئے گا اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

یہاں ریا کے ساتھ خدا اور آخرت پر عدم ایمان کا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اخلاص اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ ایمان پایا جائے۔ خدا اور آخرت پر ایمان کے بغیر کسی عمل کا ریاکاری سے پاک ہونا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔

شہرت کے لیے خدمت

شہرت سے دنیا کے چاہنے والوں کو دنیا ملتی ہے اور اس سے آدمی دنیا کے مفادات، باعزت طریقہ سے حاصل کرتا ہے۔ خدمتِ خلق شہرت اور نام آوری کا بہترین ذریعہ ہے۔ کسی کے حق میں اس شہرت کا حاصل ہونا کہ وہ انسانوں کا خیرخواہ

اور ان کا خدمت گزار ہے، اس کے بارے میں حسنِ ظن اور اعتماد پیدا کرتا ہے۔ ایک دنیادار آدمی اسے CASH کرتا ہے، اس سے وہ سوسائٹی میں عزت و توقیر اور عہدہ و منصب خریدتا ہے، دولت و ثروت سمیٹتا ہے اور ہر طرح کے مادی فوائد حاصل کرنے کے لیے اسے استعمال کرتا ہے۔ وہ انسانوں کی خدمت اس لیے نہیں کرتا کہ اسے ان سے ہمدردی ہے، بلکہ انھیں ممنونِ احسان کر کے اپنی مادی اغراض پوری کرنا چاہتا ہے جہاں اس کا امکان نہ ہو وہاں اس کا جذبۂ خدمت پژمردہ ہو جاتا ہے۔

شہرت کے لیے خدمت کا انجام

شہرت کے لیے کسی کارِ خیر کو انجام دینا خدا کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ اس سے اس کا غضب بھڑکتا ہے۔ اس پر جو وعید آئی ہے اسے بیان کرتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ پر بار بار غشی طاری ہو گئی اور حضرت معاویہؓ سن کر زار و قطار رونے لگے۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت میں اللہ تعالےٰ جب بندوں کے اعمال کا فیصلہ کرنے کے لیے نزول فرمائے گا تو سب سے پہلے تین (طرح کے) آدمیوں کا فیصلہ فرمائے گا۔ ان میں سے ایک تو شہید ہوگا۔ وہ پیش ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں جو قوت و صلاحیت اور توانائی عطا کی تھی اسے یاد دلائے گا۔ وہ اس کا اعتراف کرے گا۔ اس پر سوال ہوگا کہ تو نے اس احسان کا کیا شکر ادا کیا اور یہ تیری قوت و طاقت کہاں صرف ہوئی؟ عرض کرے گا اے اللہ! تو نے جہاد کا حکم دیا تھا میں نے اس کی تعمیل کی۔ اپنی قوتوں کو تیری راہ میں لگا دیا اور تیرے دشمنوں سے لڑتے ہوئے جان دے دی۔ ارشاد ہوگا تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے جہاد اس لیے کیا تھا کہ تمھیں جری اور بہادر کہا جائے۔ دنیا میں تمھاری جرأت اور بہادری کے خوب چرچے ہوئے اور تمھاری مراد پوری ہو گئی۔ اس کے بعد حکم ہوگا

کہ اسے چہرہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے۔ وہ جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

دوسرا شخص عالم اور قاری ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اسے یاد دلائے گا کہ کیا ہم نے تمھیں اپنی کتاب کے علم سے نہیں نوازا تھا؟ وہ اسے تسلیم کرے گا۔ سوال ہوگا کہ تم نے اس کا کیا شکر ادا کیا؟ عرض کرے گا کہ تو نے مجھے جو علم دیا تھا میں نے اسے پھیلایا، قرآن مجید پڑھا، حفظ کیا اور شب و روز اس کی تلاوت کرتا رہا۔ ارشاد ہوگا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ تمھیں عالم اور قاری کہا جائے۔ اس حیثیت سے تمھاری شہرت ہو چکی۔ تمھارا صلہ تمھیں مل گیا۔ حکم ہوگا کہ منھ کے بل گھسیٹ کر اسے بھی جہنم میں پھینک دیا جائے اور وہ پھینک دیا جائے گا۔

تیسرا شخص صاحبِ ثروت اور دولت مند ہوگا۔ وہ پیش ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کیا ہم نے تمھیں ہر طرح کے مال و دولت سے نہیں نوازا تھا؟ وہ اللہ تعالےٰ کے احسانات کا اعتراف کرے گا۔ سوال ہوگا کہ تم نے ان احسانات کا کیا کیا؟ عرض کرے گا۔ میں نے صلۂ رحمی کی، نیکی کے کاموں میں خرچ کیا، جس راستہ میں بھی پیسہ کا صرف کرنا تجھے پسند تھا میں نے اس میں صرف کیا۔ ارشاد ہوگا۔ جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ تمھیں سخی اور داتا کہا جائے۔ یہ ہو چکا۔ دنیا میں تمھاری سخاوت کے چرچے ہو گئے۔ پھر اسے بھی منھ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا[1]

خدا کے ان ریاکار بندوں سے، جن امور کے بارے میں سب سے پہلے سوال ہوگا، ان کا تعلق بعض اہم دینی خدمات سے ہے۔ انھیں خدمتِ خلق کے کام کہنا بھی صحیح ہوگا۔ علم کا پھیلانا اور امورِ خیر میں اپنی دولت کا خرچ کرنا واضح طور پر بندگانِ خدا کی خدمت ہے۔ جہاد اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم و غالب کرنے اور دنیا سے

---

[1] یہ حدیث مسلم میں کسی قدر اختصار کے ساتھ ہے۔ کتاب الامارۃ، باب من قاتل للریاء والسمعۃ الخ۔ ترمذی میں پوری تفصیل ہے۔ ابواب الزہد، باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ۔ نیز ملاحظہ ہو۔ نسائی، کتاب الجہاد، باب من قاتل لیقال فلان جری۔

ظلم وجور کو ختم کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اپنے وسیع مفہوم کے لحاظ سے یہ بھی خدمتِ خلق ہے۔ ان خدمات کے پیچھے شہرت کی طلب ہو تو صرف یہی نہیں کہ ان کا اجر و ثواب رائیگاں جاتا ہے بلکہ آدمی خدا کے غضب کا نشانہ بنتا ہے۔

اخلاص سے خدمت کا بے پایاں ثواب

جہاں اخلاص ہو وہاں انسان کا دل اپنے جیسے انسانوں سے کسی انعام اور صلہ کی تمنا سے پاک ہوتا ہے۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اعمال کا کوئی دوسرا محرک نہیں ہوتا۔ اس کا انفاق، انسانوں سے اس کی ہمدردی و غم گساری اس لیے نہیں ہوتی کہ اس کی ثنا خوانی ہوگی اور اس کے قصیدے پڑھے جائیں گے یا وہ اس ہمدردی سے دنیا اور متاعِ دنیا خرید سکے گا بلکہ اسے وہ اپنا فرض سمجھتا ہے، جذبۂ شکر سے اس کا سر جھک جاتا ہے کہ خدا نے اپنے بندوں کی خدمت کی اسے توفیق بخشی۔ سورۂ دہر میں ان کے جذبات کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ○ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ○ (الدہر: ۸-۱۰)	اور اللہ کی محبت میں وہ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کھلاتے ہیں۔ ہم تم سے کوئی بدلہ یا شکریہ نہیں چاہتے۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کا ڈر ہے جو سخت اور طویل ہوگا۔

ان آیات کے بعد ان انعامات کا ذکر ہے جن سے اللہ تعالیٰ اپنے ان مخلص بندوں کو نوازے گا۔ کردار کی یہ بلندی، خدمت کے ساتھ یہ خاکساری صرف اخلاص سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی دوسرے محرک میں یہ قوت اور توانائی نہیں ہے۔

ان نیک اور خدا ترس بندوں کے بارے میں ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ٥ (آل عمران: ۱۳۴)

.... جو خوش حالی اور تنگی میں خرچ کرتے رہتے ہیں اور غصہ کو پی جاتے ہیں اور معاف کرتے ہیں لوگوں کو، اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس میں اصحاب تقویٰ کی دو خوبیاں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ تنگی اور ترشی ہر حال میں انفاق کرتے ہیں۔ دوسری یہ کہ عفوو درگزر سے کام لیتے ہیں۔ ان دونوں خوبیوں میں بڑی مناسبت محسوس ہوتی ہے۔ آدمی ہاتھ بڑھا کر خرچ کرتا ہے تو اس کے اندر بڑائی کا احساس ابھرنے لگتا ہے۔ وہ کم از کم ان لوگوں کو جن پر احسان کرتا ہے فرد تر خیال کرتا ہے۔ ان سے کوئی گستاخی اور بے ادبی، اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ ان کی غلطیوں کو معاف کرنا اور ان کی خدمت کرتے رہنا بڑے دل گردے کی بات ہے۔ قرآن کے یہ الفاظ اشارہ کرتے ہیں کہ بے پناہ انفاق کے باوجود اللہ کے بندوں میں خاکساری اور فروتنی پائی جاتی ہے۔ وہ کسی کو نشانۂ ملامت بنانے اور اُسے رسوا کرنے کے بہانے نہیں تلاش کرتے بلکہ خطا کاروں کو بھی معاف کردیتے ہیں۔ وہ کسی کی خدمت سے اس لیے ہاتھ نہیں روک لیتے کہ اس نے ان کے ساتھ زیادتی کی۔ لوگوں کی زیادتیوں سے ان کا خدمت کا سلسلہ ٹوٹتا نہیں جاری رہتا ہے۔ انسانوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے۔

احسان جتا کر ثواب ضائع نہ کیا جائے

اسی کا دوسرا پہلو ایک جگہ یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ والے انفاق کے بعد احسان نہیں جتاتے۔ احسان جتانا کم ظرفی کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن کو طبع بلند عطا کرتا ہے اور اس کمزوری میں اسے مبتلا ہوتے نہیں دیتا۔ ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (البقرہ:۲۶۲)

یہ لوگ ہیں جو اللہ کے راستہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں اور خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ تکلیف دیتے ہیں۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ وہ غم میں مبتلا ہوں گے۔

خدا فراموش انسان کسی پر احسان کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ وہ اس کا اعتراف کرے، اس کا ممنونِ احسان ہو، اس کا دعاگو رہے، اس کی خدمت اور عزت و احترام کرے، اس کے جود و سخا اور نوازشات کا چرچا کرے، اس کے مطالبات پورے کرے اس کی چشم و ابرو کے اشاروں کو سمجھے اور اس کے احکام کی تعمیل کرے۔ جب یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو وہ اسے ذلیل کرنے پر اتر آتا ہے، اس کی تنگ دستی اور اپنے احسان کا بار بار ذکر کر کے اسے اذیت پہنچاتا ہے اور کچوکے لگانے کا کوئی موقعہ ضائع جانے نہیں دیتا۔ یہ ذہنی اور روحانی اذیت کسی بھی شریف انسان کے لیے جسمانی اذیت سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔

احسان جتا کر کسی کی خودی کو مجروح کرنے سے قرآن مجید کے نزدیک بہتر یہ ہے کہ آدمی دو میٹھے بول بول کر معذرت کر دے۔ اس سے اس کی عزتِ نفس پامال نہ ہوگی اور وہ محسوس کرے گا کہ اس کا سابقہ ایک ہمدرد اور شریف انسان سے ہے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ (البقرہ: ۲۶۳)

نرمی سے جواب دینا اور درگزر فرمانا بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے پیچھے اذیت ہو، اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔

اعمالِ خیر کے بعد احسان جتانا انھیں ضائع کرنا ہے۔ اس لیے اس نے تاکید فرمائی:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اے ایمان والو، اپنے صدقات کو

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (البقرہ: ۲۶۴)

احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع مت کرو۔

حدیث میں احسان جتانے پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا ينظر اليهم ولهم عذاب اليم۔ المنّان الّذى لا يعطى شيئًا الا منّهُ والمنفق سلعته بالحلف الفاجر والمسبل ازاره [1]

تین قسم کے انسان ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ بات کرے گا اور نہ انھیں دیکھے گا اور انھیں دردناک عذاب ہوگا ان میں سے ایک ہے احسان جتانے والا جو کسی کو کچھ دیتا ہے تو اس کا احسان جتاتا ہے۔ دوسرا ہے جھوٹی قسم کھا کر اپنا سامان بیچنے والا۔ تیسرا ہے (تکبر سے) اپنا تہہ بند زمین پر لٹکانے والا۔

کم ظرف انسان، احسان جتا کر اور تکلیف دے کر اپنی عظمت تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ یہ اس کی خام خیالی ہے۔ عظمت ان افراد کے حصہ میں آتی ہے جو انسانوں سے کسی صلہ کی تمنا سے بے نیاز ہو کر ان کی خدمت کرتے ہیں۔ یہی انسانوں کے محبوب ہیں اور یہی خدا کے محبوب۔

---

[1] مسلم کتاب الایمان، باب غلظ تحریم اسبال الازار الخ

کتاب کے مآخذ

کتاب میں جن مآخذ کا حوالہ دیا گیا ہے، ذیل میں ان کے مصنفین، مطابع اور سنینِ طباعت کی تفصیل دی جا رہی ہے، البتہ حدیث کی جن کتابوں کے حوالے کتب و ابواب کی صراحت کے ساتھ دیئے گئے ہیں ان کے مطابع کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	مطبع اور سنہ طباعت
۱-		قرآن مجید (منزل من اللہ)	
	تفسیر		
۲-	فخر الدین محمد الرازی (امام رازی)	مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر)	المطبعۃ العامرۃ الشرقیۃ مصر ۱۳۰۸ھ
۳-	عماد الدین اسمٰعیل (ابن کثیر)	تفسیر القرآن العظیم	مطبعۃ مصطفیٰ احمد مصر ۱۳۵۶ھ
۴-	محمد حسین بن مسعود الفراء البغوی (علامہ بغوی)	معالم التنزیل	مطبعۃ التقدم مصر ۱۳۴۵ھ
۵-	علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی (خازن)	لباب التاویل فی معانی التنزیل المعروف بالتفسیر الخازن	مطبعۃ التقدم مصر ۱۳۴۵ھ
	حدیث		
۶-	محمد بن اسمٰعیل (الامام البخاری)	صحیح البخاری	
۷-	ابو الحسین مسلم بن الحجاج (الامام مسلم)	صحیح مسلم	
۸-	سلیمان بن اشعث السجستانی (الامام ابو داؤد)	سنن ابی داؤد	
۹-	ابو عیسیٰ الترمذی	جامع الترمذی	
۱۰-	ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب النسائی	سنن النسائی	
۱۱-	ابو عبد اللہ ابن ماجہ	سنن ابن ماجہ	
۱۲-	الامام ابو عبد اللہ مالک بن انس	مؤطا مالک مع شرحہ تنویر الحوالک	عیسیٰ البابی حلبی وشرکاؤہ مصر ۱۳۴۳ھ
۱۳-	الامام احمد بن حنبل	المسند للامام احمد	المطبعۃ المیمنیہ مصر ۱۳۱۳ھ

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	مطبع اور سنہ طباعت
۱۴-	محمد بن اسمٰعیل البخاری	الادب المفرد مع فضل اللہ الصمد	المطبعۃ السلفیہ قاہرہ ۱۳۷۸ھ
۱۵-	احمد بن الحسین بن علی البیہقی	السنن الکبریٰ	دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۱۳۵۵ھ
۱۶-	عبدالعظیم بن عبدالقوی (المنذری)	الترغیب والترہیب من الحدیث الشریف	نول کشور۔ لکھنؤ ۱۳۵۵ء
۱۷-	ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی	مشکوٰۃ المصابیح	اصح المطابع۔ لکھنؤ
	شروح حدیث		
۱۸-	ابوسلیمان احمد بن سلیمان محمد الخطابی	معالم السنن	مطبعۃ العلمیہ حلب ۱۳۵۱ھ
۱۹-	محی الدین ابوزکریا یحییٰ (النووی)	شرح صحیح مسلم	اصح المطابع۔ دہلی ۱۳۴۹ھ
۲۰-	شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی ابن حجر العسقلانی	فتح الباری بشرح البخاری	المطبعۃ الخیریہ۔ مصر ۱۳۲۹ھ
۲۱-	عبدالرؤف المناوی	التیسیر بشرح الجامع الصغیر	دارالطباعۃ العامرہ بمصر ۱۲۸۶ھ
۲۲-	محمد بن عبدالباقی بن یوسف الزرقانی	شرح المؤطا لامام مالکؒ	مطبعۃ خیریۃ۔ مصر
۲۳-	محمد بن علی بن محمد الشوکانی	نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار	ادارۃ الطباعۃ المنیریہ بمصر ۱۳۴۴ھ
	فقہ و فتاویٰ		
۲۴-	برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی	الہدایہ (شرح بدایۃ المبتدی)	مطبع مجتبائی۔ دہلی ۱۹۳۱ء
۲۵-	ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی	کنز الدقائق	مطبع القاسمی۔ دیوبند
۲۶-	محمد علاء الدین الحنفی	الدرالمختار شرح تنویر الابصار	مطبعۃ عثمانیہ مصر ۱۳۲۷ھ
۲۷-	محمد امین الشہیر ابن عابدین	ردالمختار علی الدرالمختار	
۲۸-	محمد بن احمد بن محمد بن احمد (ابن رشد القرطبی)	بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد	قاہرہ ۱۹۲۸ء
۲۹-	ابوعبداللہ بن احمد بن محمد (ابن قدامۃ المقدسی)	المغنی	مکتبہ ریاض ۱۹۸۱ء
۳۰-	عون الدین ابوالمظفر یحییٰ بن محمد (ابن ہبیرۃ الحنبلی)	الافصاح عن معانی الصحاح	مطابع الدجوی۔ القاہرہ۔ عابدین۔

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	مطبع اور سنہ طباعت
۳۱۔	تقی الدین احمد (ابن تیمیۃ الحرانیؒ)	مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ	دار العربیہ، بیروت سنہ ۱۳۹۸ھ

سیرت وتاریخ

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	مطبع اور سنہ طباعت
۳۲۔	ابن سعد	الطبقات الکبریٰ	طبع بیروت سنہ ۱۹۶۰ء
۳۳۔	ابو محمد عبد الملک ابن ہشام	سیرۃ النبیؐ تحقیق محمد محی الدین عبد الحمید	مطبعۃ الحجازی۔ قاہرہ سنہ ۱۹۳۷ء
۳۴۔	محی الدین ابو زکریا یحییٰ النووی	تہذیب الاسماء واللغات	ادارۃ الطباعۃ المنیریہ۔ مصر

لغت

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	مطبع اور سنہ طباعت
۳۵۔	ابو طاہر محمد بن یعقوب (الفیروز آبادی)	القاموس المحیط	نول کشور۔ لکھنؤ
۳۶۔	مجد الدین ابو السعادات المبارک المعروف بابن اثیر الجزری	النہایہ فی غریب الحدیث	المطبعۃ العثمانیہ۔ مصر سنہ ۱۳۱۱ھ
۳۷۔	ابو الفضل جمال الدین ابن منظور الافریقی	لسان العرب	طبع بیروت سنہ ۱۹۵۵ء
۳۸۔	حمید الدین الفراہی	مفردات القرآن	مطبعۃ اصلاح۔ اعظم گڑھ (الہند) سنہ ۱۳۵۸ھ

مولانا سید جلال الدین عمری (پ: ۱۹۳۵ء) عالم اسلام کے ایک جید عالم دین، عمدہ خطیب، ممتاز محقق اور مشہور مصنف کی حیثیت سے معروف ہیں۔ قرآن وسنت کا گہرا علم رکھتے ہیں اور جدید علوم وفنون پر بھی اچھی نظر ہے۔ علمی میدان میں موضوعات کا تنوع، اسلوب کی انفرادیت، طرز استدلال کی ندرت اور زبان وبیان کی شگفتگی ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

مولانا عمری معروف دینی درس گاہ جامعہ دارالسلام عمرآباد (تمل ناڈو) کے فارغ التحصیل، مدراس یونیورسٹی سے فارسی میں منشی فاضل اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے انگریزی میں گریجویٹ ہیں۔ اس وقت جامعۃ الفلاح (بلریا گنج، اعظم گڑھ، اتر پردیش) بھارت کے شیخ الجامعہ اور سراج العلوم نسواں کالج، علی گڑھ کے سرپرستِ اعلیٰ ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے علمی اداروں سے بھی موصوف کا تعلق ہے۔

مولانا عمری کو شروع سے ہی تحقیق وتصنیف سے شغف رہا ہے۔ اس میدان میں ان کی نمایاں خدمات ہیں۔ ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ اور تصنیفی اکادمی، دہلی کے صدر ہیں۔ مشہور سہ ماہی مجلّہ ''تحقیقاتِ اسلامی'' علی گڑھ کے ۲۱ سال سے مدیر ہیں اور تقریباً پانچ سال تک ماہنامہ ''زندگی نو'' دہلی کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔ مختلف موضوعات پر آپ کی تیس سے زائد تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ان میں سے متعدد کتابیں اردو کے علاوہ عربی، انگریزی، ترکی، ہندی، ملیالم، تلگو، مراٹھی، گجراتی، بنگلہ اور تمل میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

اسلام کا معاشرتی نظام مولانا کی دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے۔ عورت اسلامی معاشرے میں، مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ، عورت اور اسلام، مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں اس کا بہترین ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ مولانا کی چند دیگر تصانیف درج ذیل ہیں:

- ★ غیر مسلموں سے تعلقات اور اُن کے حقوق
- ★ خدا اور رسول کا تصور اسلامی تعلیمات میں
- ★ خدا کی غلامی ـــ انسان کی معراج
- ★ اسلام: انسانی حقوق کا پاسبان
- ★ اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور
- ★ عورت اسلامی معاشرے میں
- ★ انسان اور اُس کے مسائل
- ★ اسلام اور وحدت بنی آدم
- ★ اسلام اور مشکلاتِ حیات
- ★ دولت میں خدا کا حق
- ★ اسلام کی دعوت
- ★ بچے اور اسلام
- ★ معروف ومنکر
- ★ وقتِ حساب